[illegible] NO 7243

Phone [illegible]0800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1976

معمارانِ پاکستان کون تھے؟

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - ۲ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
۱/۵۰	۸۰۸۰۰	سالانہ
ڈیڑھ روپیہ	خط و کتابت	پاکستان ـــــ ۱۸ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	ممالک ـــــ ۲ پونڈ
شمارہ ۸	اگست ۱۹۷۶ء	جلد ۲۹

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــــــــــــــــــ ۲

۲۔ معمارانِ پاکستان ـــــــــــــ محترم پرویز صاحب ـــــــ ۹

۳۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کا یوم تاسیس ـــــ شاہد ہادی ـــــ ۳۳

۴۔ بزم مذاکرہ (طلوعِ اسلام کنونشن) ـــــــــــ ۴۱

۵۔ فرقۂ اہل قرآن کی نمازیں ـــــــــــــــ ۵۷

۶۔ معراجِ انسانیت ـــــــــــــــــــ ۶۲

۷۔ مقامِ حدیث ـــــــــــــــــــــ ۶۳

۸۔ اعلانات ـــــــــــــــــــــــــ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ عزیز ... پرنٹنگ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہر سال، موسم بہار آتا ہے۔ جس میں کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے۔ جنگل میدانوں تک سبزۂ نورستہ اور خشک ٹہنیوں تک سے گلِ نودمیدہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے۔ اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ فَانظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (۳۰ : ۵۰)۔ تم جیدار فیض کی نیستاں بادیوں اور گہر فشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کر دی ہے۔ لیکن یہی بہار جو ہر قلبِ افسردہ کے لئے نشیدِ حیات بنتی ہے (ہمارے شعراء کی زبان میں) دیوانگانِ عشق کے لئے پیغامِ جنون اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس میں دامنوں کی دھجیاں اڑتی ہیں۔ گریبان چاک چاک ہو جاتے ہیں۔ مندمل زخم پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں۔ درد و کرب کے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت ہمارے یومِ آزادی (۱۴ اگست) کی تقریب کی ہے۔ آزادی دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے۔ اس مبارک و مسعود تاریخ کو ہم اس سے ہمکنار ہوئے تھے۔ پھر دنیا کے لئے آزادی سے مفہوم اپنی خودمختار مملکت کا قیام ہوتا ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی تھا اور اس پر مستزاد کچھ اور جس میں ہم منفرد تھے۔ یعنی ہمارے لئے یہ مملکت مقصود بالذات نہیں تھی، بلکہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ یعنی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ کہ اس خطہ میں قرآنی نظام کے قیام کے امکان سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ اس کا احساس ہی مسرت و انبساط کی شمعیں فروزاں کرنے کا موجب تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔

لیکن حصولِ آزادی کی یاد کے ساتھ ہی ہماری یہ یادیں بھی بے ساختہ تازہ ہو جاتی ہیں کہ ہمیں کس قسم کے دشمن کے ساتھ واسطہ پڑا تھا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا اور کیا کر رہا ہے۔ اس الم انگیز داستانِ خونچکاں کے سلسلہ میں "طلوعِ اسلام" گذشتہ انتیس سال سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے۔ (بالخصوص پرویز صاحب کے دو اہم اور مفصل مقالات بہ عنوان (۱) ہندو کیا ہے۔ اور (۲) ہمارا ازلی دشمن اس باب میں حقیقت کشا دستاویزات ہیں۔) لیکن جب ۱۴ اگست کی تقریب آتی ہے تو اس کا تذکرہ بے ساختہ لبوں پر آجاتا ہے۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے (یعنی تشکیل پاکستان کے صرف چھ سال بعد کی بات) جب اس زمانے کے بھارت کے وزیرِ اعظم (پنڈت جواہر لعل نہرو آنجہانی)،

مسئلہ کشمیر اور دریاؤں کے پانی کی تقسیم جیسے اہم معاملات کے متعلق گفتگوئے "مصالحت" کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے۔ ہم نے اس تقریب پر "طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۶۰ء" میں لمعات لکھے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں بغرضِ تجدید یادداشت، پھر پیشِ خدمت قارئین کر دیا جائے۔ بالخصوص اس لئے کہ (کم از کم) گیارہ سال کی تلخ شیریں کی نبرد آزمائیوں کے بعد، بھارت پھر ہماری طرف مصالحت و مفاہمت کے ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ سنیئے اور غور سے سنیئے کہ ہم نے اس زمانے میں کیا لکھا تھا۔

"جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں، مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ یہ معاملات کے فیصلے عقل و خرد اور فکر و تدبر کی بجائے جذبات کی رُو سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ذرا تاؤ میں آئے تو خواہ مخواہ "مُکّا" دکھا دیا اور اس کے برعکس کسی نے ذرا چکنی چپڑی باتیں کیں، اور یہ بچھ گئے۔ ظاہر ہے کہ دنیائے معاملات (بالخصوص بساطِ سیاست) میں اس روش کی حامل قوم، قدم قدم پر پٹ جاتی ہے۔ ویسے تو مسلمانانِ پاکستان کی زود فراموشیوں اور ارزاں فروشیوں کے کئی مناظر اس قلیل سی مدت میں دیدۂ بینا کے سامنے آ چکے ہیں لیکن گذشتہ ماہ، بھارت ورش کے مہامنتری پنڈت جواہر لال نہرو کے پاکستان تشریف لانے پر اس کا مظاہرہ جس وسعت اور شدت سے ہوا اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان کی آمد پر قوم کی طرف سے جن جذبات کا اظہار ہوا، ان سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کے نزدیک وہ مسیحا آ پہنچا ہے جس کے ہاتھ میں ان کے تمام دکھوں کا مداوا اور ان کی تمام مصیبتوں کا حل ہے۔ ہر ایک یوں سمجھے بیٹھا تھا کہ نہرو جی پورے کا پورا کشمیر ان کے حوالے کر دیں گے۔ تمام دریاؤں کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیں گے تاکہ یہاں آب پاشی کے لئے پانی کی قلت نہ رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر سے اپنی چھاؤنیاں اٹھا لیں گے۔ جو کچھ آج تک چور دروازوں کے راستے ہندوستان جا رہا ہے اس کی روک تھام کر دیں گے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی تمام جائدادوں کی قیمت نقد ادا کر دیں گے اور جائدادوں کے علاوہ یہ لوگ جو کچھ وہاں چھوڑ آئے ہیں وہ سب کچھ یہاں پہنچا دیں گے۔ یہ کچھ عوام تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہمارے اربابِ سیاست تک بھی اسی فریب میں مبتلا تھے کہ اب پاکستان اور ہندوستان کے متنازعہ فیہ امور کی تمام گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ ہم یہ کچھ دیکھ رہے تھے اور محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ! یہ قوم بھی کس قدر سادہ اور بھولی واقع ہوئی ہے! بارے غنیمت ہوا کہ یہ فریب زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ نہرو جی نے یہاں کے احوال و کوائف کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا اور اس کے بعد نہایت اطمینان سے کشمیر میں وہ کچھ کر دیا جس سے مسلمانانِ عالم کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، پاکستان کے وزیر اعظم مسئلہ کشمیر کے متعلق ہندوستان کے وزیر اعظم کے ساتھ گفتگوئے مصالحت میں مصروف ہیں۔ ہم پیش گوئی تو نہیں کرنا چاہتے کہ ان مذاکرات کا آخری نتیجہ کیا ہوگا لیکن اس دوران میں ہم اتنا بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے بارہ میں ہمیں قرآن مجید سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوعِ انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے فرق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے تو تم ظالم کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واضح

الفاظ میں بتاتا ہے کہ حق و باطل، کفر و ایمان، نور و ظلمت اور فساد و صالحیت کے اعتبار سے دنیا میں دو متضاد اور باہمدگر مخالف گروہ چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں کہیں حق اور باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو یہی دو گروہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتے ہیں۔ وہ حق و صداقت کے حامیوں کو حزب اللہ یا جماعت مومنین کہہ کر پکارتا ہے اور ان کے حریف ..... مقابل کو حزب الشیطان یا کفار کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن، مومن کا دوست ہوتا ہے (والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض ۹ : ۷۱) اور کافر کافر کا دوست ہوتا ہے۔ والذین کفروا بعضهم اولیاء بعض ۸ : ۷۳) اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کفار کا گروہ ہمیشہ تمہارا مخالف اور دشمن رہے گا۔ (ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا ۴ : ۱۰۱) لہٰذا:

> جو لوگ ایمان والے ہیں انہیں کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ تمہیں چاہیئے کہ کفار کی طرف سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام رکھو (۳ : ۲۷)

دوسری جگہ ہے:

> اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے وہ ہمیشہ تمہاری مضرت ہی کی تلاش میں رہتے ہیں بغض و عداوت ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن جو کچھ ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے ...... اگر کہیں تمہارے بھلے کی بات ہو جائے تو وہ ان کے لئے غم کا موجب بن جاتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم ثابت قدم رہو اور ان کی طرف سے اپنی حفاظت کرتے رہو تو پھر ان لوگوں کی تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ (۳ : ۱۱۷-۱۱۹)

پھر تو ایک مقام پر یہاں تک کہہ دیا کہ:

> اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ جو کوئی ان سے دوستی کے تعلقات قائم کرے گا تو یاد رکھو اس کا شمار بھی انہی میں ہو جائے گا۔ (۹ : ۲۳)

سورۂ مجادلہ میں ہے کہ:

> تم کبھی ایسا نہ دیکھو گے کہ وہ لوگ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرنے لگیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے باپ، اپنے بھائی اور اپنے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ (۵۸ : ۲۲)

اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے متعلق بھی جو دین خداوندی کی تضحیک کرتے ہوں، صاف صاف طور پر کہہ دیا کہ انہیں کبھی اپنا دوست نہ بناؤ۔ (۵ : ۵۷) یہ قرآن کریم کے صریح احکام ہیں جن کے لئے نہ کسی تفسیر کی ضرورت ہے نہ تشریح کی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے انسانی تعلقات کی بنیاد ہی جداگانہ تجویز کی ہے۔ وہ ان تعلقات کو نظریہ حیات (IDEOLOGY) کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی قوم، کسی نسل اور کسی خطہ کے ہوں، (IDEOLOGY) کے اشتراک کی بنیاد پر ایک ملت بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ

اس (IDEOLOGY) کے مخالف ہوں وہ ان کے مخالفین قرار پاتے ہیں۔ وہ جماعتِ مخالف کے ساتھ عدل و انصاف کے برتاؤ کا تو حکم دیتا ہے۔ لیکن ان سے اعتماد، بھروسہ، رازداری اور دوست داری کے تعلقات سے بڑی شدت سے روکتا ہے اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم آپ کی (IDEOLOGY) کی مخالف ہو وہ آپ کی بہبودی اور خوش حالی کی بھی آرزو مند ہو گی۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ تمہاری مصیبتوں سے خوش ہو گی۔ اور تمہاری راحتیں ان کے لئے سوہانِ روح بن جائیں گے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی اسکیم یا تدبیر کی تائید کریں۔ جو آپ کے لئے نفع مند ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی لیکن اسلام سے خالی نسبت بھی ہمارا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی بنا پر دنیا کا کوئی غیر مسلم کبھی ہمارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوؤں کی طرف سے جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا رہا، وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اسے اندھوں نے بھی دیکھا اور بہروں نے بھی سنا ہے۔ آپ اس بیس سالہ زندگی پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کو اس ہمسایہ قوم میں شرفِ انسانیت کی کوئی جھلک بھی دکھائی دی ہے؟ اس کے برعکس، وعدہ خلافی، دروغ بافی، کذب تراشی، افترا پردازی کی کوئی شق بھی ایسی ہے جسے انہوں نے آپ کے خلاف اختیار نہ کیا ہو؟ درازدستی، سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ کی کوئی شق ایسی ہے جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے نہ ہو چکا ہو؟ معاہدات شکنی، بین الاقوامی قوانین سے سرکشی، حقوقِ ہمسائگی کی حدود فراموشی، فیصل شدہ معاملات کی خلاف ورزی کی کوئی صنف ایسی ہے جو ان کی طرف سے عمل میں نہ لائی جا چکی ہو؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قتل و غارت گری، تباہی اور بربادی، عصمت دری اور عفت ربودگی، مسلم کشی اور انسانیت سوزی کی کوئی داستان ایسی ہے جو ان کے سیاہ کارناموں کے سامنے ماند پڑ چکی ہو؟ یہ اس لئے کہ خود حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم، ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں (جو انہوں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب ان کی حق گوئی پر سیاسی مصلحتوں کا پردہ نہیں پڑا تھا)

> کفار، واقعات کو جھٹلاتے ہیں، حقیقتِ حال کو جھٹلاتے ہیں، اصلیت کو چھپاتے ہیں، ماجرائے وقوع کو غلط بتاتے ہیں، نقضِ امن کرتے ہیں اور اسے جان بخشی دکھاتے ہیں، بات کچھ اور ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پیچ میں پبلک کو کچھ اور جتاتے ہیں۔ ان کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس اور شرفِ ذات کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے، اس میں دوام و استمرار ہے، یہ عہد محکم ہے، یہ قول و اقرار قانونی حیثیت رکھتا ہے زبانی سب کچھ کہتے ہیں اور ہاتھ سے کام لیتے وقت کچھ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اسلام اپنے فرزندوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل ہیں، ان کے حلف پر نہ جانا، یہ ادھر کی بات ادھر لگاتے ہیں، منعِ خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ سرکشی ان کی خو ہے، پاسِ عزت نہ رکھنے، ناموس کی نگہداشت نہ ضروری سمجھنے کی وجہ سے ان کی تو اصل تک محفوظ نہیں۔ (الہلال بابت ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء)

یہ ہے وہ شہادت جو اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد کی طرف سے پیش ہوئی ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن کے ان حقائق اور تاریخ کے ان شواہد کی موجودگی میں اور اس کے بعد خود اس تجربہ کے پیش نظر جو ان کی طرف سے ہمیں ذاتی طور پر ہو چکا ہے، ان پر کسی معاملہ میں دوستانہ بھروسہ کرنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہو۔ قرآن ہمیں یہ کہتا ہے کہ فریق مخالف کے ساتھ تعلقات معاہدہ کی رو سے قائم ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ جو لوگ اخلاقی اقدار کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک معاہدہ کی بھی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ سولن کے الفاظ میں، معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے جو اپنے سے طاقتور کے سامنے تار عنکبوت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے سے کمزور کو بڑی آسانی سے پھانس لیتا ہے اس لئے قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمہارے پاس اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ فریق مخالف معاہدہ شکنی کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری سرحدیں اس قدر مضبوط ہونی چاہئیں جن سے دشمن کے دل دہل جائیں۔ لہٰذا ہمیں ہندوستان یا کسی دوسرے ملک سے معاہدہ کرنے سے پہلے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرنی چاہیئے جو استواری عہد کی ضامن بن سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ طاقت کا دوسرا نام فوج ہے۔ لیکن دور حاضر میں شہری آبادی (CIVIL POPLLATION) کی طاقت کو فوجی طاقت کے مقابلہ میں کچھ اہمیت حاصل نہیں۔ فوجی طاقت انڈے کا چھلکا ہوتی ہے۔ اگر انڈا کچا ہے تو وہ چھلکا معمولی سی ٹھیس لگنے سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن اگر انڈا ابلا ہوا (لہٰذا ٹھوس) ہے تو اس کا چھلکا بھی بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی مملکت کی قوت کا راز اس کی شہری آبادی کی یک رنگی، یکجہتی، عزیمت، ثبات، استقلال اور بلند حوصلگی میں مضمر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جوہر اسی قوم میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ جنہیں نظم و نسق حکومت پر پورا پورا بھروسہ ہو۔ جو انہیں اپنا ہمدرد اور مشفق سمجھے۔ جہاں سے انہیں عدل و انصاف کی پوری پوری توقع ہو۔ جنہیں وہ اپنے مال اور جان اور عزت و ناموس کا محافظ اور اپنے اہل و عیال کا نگران و پاسبان تصور کریں۔ جنہیں اس کا محکم یقین ہو کہ یہ نظم و نسق ہماری بہبودی، خوشحالی اور ترقی کے لئے قائم ہے، جنہیں اس پر ایمان ہو کہ اس نظم و نسق کے قیام سے عدل و احسان کا قیام وابستہ ہے اور اس کے گر جانے سے شرف انسانیت کا قصر بلند گر جائے گا۔ جس قوم کو اپنی مملکت کے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین ہو، وہ قوم اس مملکت کی حفاظت اور اسکے نظم و نسق کے استحکام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار ہوتی ہے۔ تیار ہی نہیں بلکہ بیقرار ہوتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے باشندوں کو اپنے نظم و نسق کے متعلق اس قسم کا یقین اور اعتماد ہے تو پھر آپ کو کسی گوشہ اور کسی سمت سے کوئی خوف اور اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ برابر کے معاہدات کیجئے، انہیں اس کی جرأت ہی نہیں ہو سکے گی۔ کہ وہ ان معاہدات کے ایک حرف کی بھی خلاف ورزی کر سکیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کا یقین محکم نہیں تو پھر آپ کو نہ ہندو سے کسی بھلائی کی توقع رکھنی چاہیئے نہ انگریز سے۔ نہ امریکہ سے کسی امداد کی امید کرنی چاہیئے نہ روس سے۔ دوسرے کی نگاہوں میں اسی کی عزت ہوا کرتی ہے جس کی عزت خود اپنوں کی نگاہوں میں ہو لیکن اس عزت کے ماپنے کا پیمانہ نہ تو وہ جلسے ہیں جن میں پچاس پچاس ہزار آدمی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور نہ ان کے وہ

فلک شگاف نعرے جو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہماری قوم شاعروں کی قوم ہے۔ جس کے نزدیک یہ جلسے بزم مشاعرہ اور ان کے نعرے شاعروں کی داد سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ نہ ہی اس عزت کا معیار الیکشنوں کی جیت ہے جسے ہر برسر اقتدار پارٹی تدبر کی فسوں سازیوں کی بنا پر حاصل کر سکتی ہے۔ (اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص اقتدار کی مسند سے الگ ہو جاتا ہے اس کا کسی الیکشن میں جیتنا تو درکنار، اسے کرسئے پر مکان بمشکل ملتا ہے) اس عزت کا صحیح معیار یہ ہے کہ:۔ ع

کہتی ہے تم کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

اس قسم کی صحیح عزت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے ربوبیت عامہ۔ یہ ایسی بنیادی شرط ہے کہ جو باپ اپنے بچوں کی پرورش نہیں کرتا وہ بچوں کی نگاہ میں کسی عزت کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ الحمد للہ رب العلمین کہ اللہ کی حمد و ستائش بھی اسی لئے ہے کہ وہ ربوبیت عامہ کا ذمہ دار ہے۔ جب ربوبیت کے بغیر خدا کی بھی حمد یت نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے جسے ربوبیت کے بغیر عزت حاصل ہو جائے۔ جو لوگ خالی الفاظ سے درخور حمد و ستائش بننا چاہتے ہیں، ان کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ "یریدون ان یحمدوا بما لم یفعلوا" ان بے وقوفوں کی بھول دیکھئے کہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ یہ کر کے نہیں دکھاتے اس کی وجہ سے ان کی تعریف کی جایا کرے۔

اور اس ربوبیت کا طریق فقط یہ ہے کہ مملکت میں قرآن کا تجویز کردہ نظام ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کے سوا نہ مملکت کے استحکام کا کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہی نظم و نسق مملکت کے سزاوار حمد و ستائش ہونے کا کوئی ذریعہ۔

"ونیھا لبصائر لقوم یتفکرون"۔

یہ لمعات ہم نے ستمبر ۱۹۵۳ء میں لکھے تھے۔ اس کے بعد بھی ہماری طرف سے اسی قسم کے مظاہرے ہوتے رہے تو ہم نے ستمبر ۱۹۵۵ء میں حسب ذیل شذرہ لکھا۔

اس باب میں ایک اور ضروری گذارش بھی ہے۔ اب اس حقیقت کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ہندو، پاکستان کا بدترین دشمن ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جسے ہم بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ بھی جانتا ہے اور ہم ساری دنیا سے کہتے ہیں کہ وہ بھی اسے اچھی طرح جان لے۔ ایک طرف تو یہ حقیقت ہے۔ لیکن دوسری طرف ہوتا یہ ہے کہ ہم مختلف تقاریب پر ایک دوسرے کو مبارک باد کے پیغامات بھیجتے ہیں۔ ہمدردیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ثقافتی روابط (CULTURAL- RELATIONS) قائم کرتے ہیں۔ خیر سگالی کے وفد ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جو قوم کسی قوم کی اس طرح کھلی ہوئی دشمن ہو، کیا اس سے اس قسم کے روابط قائم رکھے جایا کرتے ہیں؟ جو شخص آپ کے بیٹے کا قاتل ہو کیا آپ اس کے بیٹے کی شادی پر مبارک باد کے تار بھیجا کرتے ہیں؟ جو شخص آپ کے پیچھے خنجر لئے پھر رہا ہو کیا آپ اپنے جشن سالگرہ پر اس سے تحائف قبول کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ اپنی نجی اور ذاتی زندگی میں یہ کچھ نہیں کرتے تو پھر اجتماعی اور قومی زندگی میں ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی اس روش کا اثر قوم پر (یا دوسری اقوام پر) کیا پڑتا ہے؟ اس سے

سمجھا یہ جاتا ہے کہ آپ کے اور ان کے اختلافات محض جزئی اور معمولی ہیں، ورنہ درحقیقت آپ اور وہ دلی دوست اور ایک دوسرے کے بہی خواہ ہیں۔ کس قدر غلط اور نقصان رساں ہے یہ تاثر جو آپ کی یہ روش اپنے ملک میں اور بین الاقوامی حلقوں میں پیدا کر رہی ہے؟ غضب خدا کا۔ وہ بھارت جو پاکستان کے لاکھوں نفوس پہ پانی بند کر کے ایک ہفتہ تک جشنِ مسرت مناتا ہے، اس کے چند ہی روز بعد، مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے پیغامات بھیجتا ہے اور ہماری طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس نے اگر ہمدردی کا پیغام بھیجا تھا تو اس کا جواب یہ تھا کہ:

تمہارے جذباتِ ہمدردی سے حیرت ہوئی۔ تم ایک طرف لاکھوں پاکستانیوں پر پانی بند کر کے ان کی اور ان کی نسلوں کی تباہی پر جشنِ مسرت مناتے ہو اور دوسری طرف پانی میں ڈوبنے والوں پر آنسو بہاتے ہو! ہم ان آنسوؤں کو خوب سمجھتے ہیں

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں "دوست" کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا!

آپ کو یاد ہوگا کہ قائدِ اعظم کا اندازِ ترکی بہ ترکی ابوالکلام آزاد کے نام اسی قسم کا جواب تھا۔ جس نے ہندی سیاست کا رخ بدل دیا تھا۔

اسی طرح سنا ہے کہ اب ہندوؤں کی کرکٹ کی ٹیم میچ کھیلنے کے لئے پاکستان تشریف لا رہی ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ آپ نے کبھی اپنے بچوں کو ان لوگوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے دیا ہے جو آپ کی اور آپ کے بچوں کی جان کے لاگو ہوں اور جو اپنے بچوں کو ہمیشہ یہ سبق پڑھاتے رہیں کہ جس طرح بن پڑے آپ کو اور آپ کے بچوں کو تباہ و برباد کیا جائے؟ اور پھر بات یہیں تک نہیں کہ وہ آپ کے اور آپ کے بچوں کی جان کے دشمن ہیں۔ وہ دشمن ہیں اس آئیڈیالوجی کے جس کے لئے آپ نے پاکستان کو حاصل کیا ہے۔ سنئے کہ اس باب میں آپ کے خدا کا کیا حکم ہے۔ ارشاد ہے کہ:

اے وہ جو ایمان کے مدعی ہو! تم اپنے دشمنوں کو اور "میرے دشمنوں" کو کبھی اپنا دوست نہ بناؤ کہ انہیں محبت کے پیغامات بھیجنے شروع کر دو حالانکہ وہ اس ضابطۂ حیات کا انکار (اور اس کی مخالفت) کرتے ہیں جو تمہاری طرف حق کے ساتھ آیا ہے۔ وہ رسول کو اور تمہیں (تمہارے گھروں سے) نکال دیتے ہیں۔ محض اس جرم کی پاداش میں کہ تم اپنے اللہ پر ایمان رکھتے ہو؟ (۶۰ : ۱)

اس نے سیرتِ ابراہیمی کو تمہارے لئے قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا ہے لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس سیرت کا وہ کونسا پہلو ہے جسے اس حکم کی وضاحت کے لئے نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے؟ سنئے کہ قرآن کیا کہتا ہے:

تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم خدا کے سوا عبودیت اختیار کئے ہو، ان سے بے تعلق ہیں۔ ہم تم سے بیزار ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان نفرت اور عداوت ہمیشہ کھلی کھلی رہے گی جب تک تم ایک خدا پہ ایمان نہ لے آؤ۔ (۶۰ : ۴)

"عداوت اور نفرت" ان سے جو تمہارے خدا کے دشمن ہیں۔ اور یہ عداوت اور نفرت بالکل کھلی کھلی۔ یہ ہے وہ اسوۂ ابراہیمی جس کی تقلید کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اور ہم ہیں کہ ان لوگوں سے "کلچرل ریلیشنز" قائم کرتے ہیں! ایک طرف ہم اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ تم ہمارے بدترین دشمن ہو اور دوسری طرف ہم ان کی "ہمدردیوں کے پیغامات" کے شکریے ادا کرتے ہیں اور ان کے خیرسگالی کے وفود اور کھلاڑیوں کی ٹیموں کو دعوتیں دیتے ہیں! دنیا جاننا چاہتی ہے کہ یہ لوگ فی الواقعہ ہمارے دشمن ہیں یا ہم نے یونہی شور مچا رکھا ہے! دشمن تو کبھی ہمارے دوست نہیں ہوا کرتا۔ پھر اس کی "ہمدردی" کا شکریہ کیسا! اس سے مل کر تو کبھی خوشی نہیں ہوا کرتی۔ پھر ان سے ملنے کے مراسم کیسے۔

(جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ تعلقات بر بنائے معاہدات کی رسمیت اور رسمی کی حد تک ہونے چاہئیں۔ ان سے زیادہ نہیں)

باسمہٖ تعالیٰ

معمارانِ پاکستان

(بتقریبِ یومِ آزادی۔ اگست سنہ ۱۹۷۶ء)

پرویزؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معمارانِ پاکستان

گزشتہ دو تین ماہ میں، اکابرین جماعتِ اسلامی (میاں طفیل محمد، امیر جماعت اور مودودی صاحب، بانیٔ جماعت) کی طرف سے، بانیان و معمارانِ پاکستان کے خلاف جس کذب و افترا اور بہتان طرازی کا مظاہرہ ہوا، اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی سابقہ دو تین اشاعتوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ طلوعِ اسلام میں جو کچھ لکھا گیا وہ کوئی نئی بات نہیں تھی ——— وہ شروع سے ہی کچھ لکھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن ملک کے متعدد گوشوں ——— بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کی طرف سے جس قسم کے استفسارات موصول ہوئے اس سے اندازہ ہوا کہ تحریکِ پاکستان اور اس کے علمبرداران کے متعلق ہماری نئی نسل کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، اور جنہیں کچھ معلومات حاصل ہیں، وہ بڑی "مسخ شدہ" ہیں۔ یہ طبقہ بالخصوص وہ ہے جو جماعتِ اسلامی کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہے۔ یہ جماعت، تشکیلِ پاکستان کے روزِ اوّل سے جھوٹے پراپیگنڈہ میں مصروف ہے اور اس کے ساتھ اپنے متاثرین کو تاکید کرتی رہتی ہے کہ تم طلوعِ اسلام کے قریب نہ پھٹکنا، کیونکہ اس سے تمہارے "ایمان کو خطرہ" ہے۔ اس سے ہمارے اس احساس کو مزید تقویت حاصل ہوئی کہ جو کچھ ہم (پاکستان میں) گزشتہ پچیس تیس سال سے کہتے چلے آ رہے ہیں، اسے بار بار دھرانے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنا تکرار نہیں ہوگا، بلکہ نئی نسل تک صحیح معلومات بہم پہنچانے کا موجب ہوگا۔

پرویز صاحب نے تیرہ سال پہلے۔ یومِ آزادی کی تقریب پر، ایک معلومات افزا تقریر کی تھی۔ جس کا عنوان تھا ——— پاکستان کس نے بنایا ——— مندرجہ بالا ضرورت کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ امسال، یومِ آزادی کی تقریب پر، اس تقریر کو (بادنیٰ تغیر و اضافہ) دوبارہ شائع کیا جائے، اور اسے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں عام کیا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ پاکستان کس نے بنایا تھا، اور کیوں بنایا تھا؟ امید ہے ہماری یہ کوشش مفید نتائج مرتب کرے گی۔

(طلوعِ اسلام)

معمارانِ پاکستان

کہتے ہیں کہ جب سیمرغ[1] (PHOENIX) کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری دن قریب آ گئے ہیں تو وہ اپنے گرد تنکے جمع کر لیتا ہے اور اس آشیاں میں بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے جس سے اس کے پروں سے شعلے نکلتے ہیں۔ ان سے اس کا آشیانہ بھی جل جاتا ہے اور وہ خود بھی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس راکھ پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو اس میں سے ایک نیا سیمرغ پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں کی حیاتِ نو

سیمرغ کے متعلق تو معلوم نہیں، لیکن جن قوموں میں زندگی کی کوئی رمق بھی باقی ہوتی ہے، حوادثِ زمانہ انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بھی کیوں نہ بنا دیں، ان کی خاکستر کے نیچے دبی ہوئی چنگاری ابھرتی ہے اور اس سے ایک ایسا زندہ انسان پیدا ہو جاتا ہے جو اس قوم کو حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا جب کہا تھا کہ ؎

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

۱۸۵۷ء کے بعد

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ــــــ کہ جسے انگریز کی استعماریت نے "غدر" سے تعبیر کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی ــــــ مسلمان یکسر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے تھے۔ ان کی سلطنت ہی نہیں چھنی تھی، ان کی ملی ہستی ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک قوم کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے تھے۔ انگریز کی سیاست نے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَھُمْ کی ملت کش پالیسی اختیار کر کے۔ ایک بار پھر فرعونی استبداد کی یاد تازہ کرا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام ان مسلمانوں سے لے گا جو کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے ہر اس اقدام کا مورد مسلمانوں کو ٹھہرایا جو انہیں خوار و زار و رسوا کرنے کا بہانہ بن سکے۔ "لائف محمڈنز اوف انڈیا" کے مصنف کے الفاظ ہیں:

> اُس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا تھا، خواہ اسے رام دین اور ماتا دین نے ہی برپا کیوں نہ کیا ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے ایسی نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ

---

[1] یہ ایک افسانوی پرندہ ہے۔ کوئی اسے ہمیشہ کہتا ہے کوئی ققنس۔ کوئی [illegible]

> تاگا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا ہے۔

یہی تھے اس قوم کے وہ ناکردہ گناہ جن کی پاداش میں ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب (دی انڈین مسلمانز) میں تجویز کر دیا کہ مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام لکڑہاروں اور سقوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

سرسیدؒ کی نمود

لیکن عین اسی زمانے میں خود انگریزی حکومت کے ایک دفتر کا معمولی ملازم (صدر امینی کا سررشتہ دار) جس کے بچپن اور جوانی کا زمانہ، خود اس کے اپنے الفاظ میں "کبڈی کھیلنے، کنکوے اڑانے اور ناچ مجرے دیکھنے میں" گزرا تھا، اس قوم کی خاکستر سے چنگاری بن کر ابھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے قوم کے عروقِ مردہ میں زندگی بخش حرارت بن کر سرایت کر گیا۔ جب اس کے دل میں قوم کو سنبھالنے کا احساس پیدا ہوا تو فضا میں چاروں طرف چھائی ہوئی مایوسی کا عالم کیا تھا، اس کے متعلق اس نے بعد میں خود کہا تھا کہ:-

> میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سرِ نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی...... آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔

یہ مسیحائے ملت، کہ قوم کے غم نے جس کے جوانی ہی میں بال سفید کر دیئے، سید احمد خان، جو بعد میں سرسیدؒ کے نام سے متعارف ہوا۔ اس زمانے میں بھی اس کے دل میں قوم کے غم کی گہرائی اور کیریکٹر کی بلندی کی کیا کیفیت تھی، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ اس نے اس عالمگیر خلفشار کے زمانے میں، محض انسانی ہمدردی کی بنا پر بہت سی انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی تھی۔ حکومت نے ان خدمات کے صلے میں روسائے چاندپور کی ضبط شدہ جاگیر اور اس کے ساتھ ایک معقول جائیداد پیش کی لیکن اس نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ:-

کیریکٹر کی بلندی

> "ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی۔"

اس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:-

> میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ چنانچہ میں نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یاد رہے کہ سرسیدؒ اس زمانے میں انگریز کی حکومت کا ملازم تھا۔ اور وقت ایسا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اس قسم کی پیشکش سے انکار، اس شخص کو باغیوں کے زمرے میں شامل کرا دینے اور پھانسی کے تختے پر لٹکوا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد سرسیدؒ کھل کر سامنے آ گیا اور ایک طرف مسلمانوں کو انگریز سے

استبداد اور ہندو کی دسیسہ کاریوں سے بچانے اور دوسری طرف ان بکھرے ہوئے تنکوں کو اکٹھا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وہ اس زمانے میں کہا کرتا تھا کہ:۔

> میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اُس کے اُس حصے کی جو نیلا نیلا سیاہ اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا، بلکہ ان ستاروں کو دیکھا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز کی کشش سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

ستاروں کو دیکھنے کی تمنّا

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے سوال کیا کرتا تھا کہ:۔

> کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی نگاہ میں باعزت بنا سکتے ہو.......؟

وہ قوم کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور قوم کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اس پر کفر کے فتوے لگانے کے جہادِ عظیم میں مصروف تھے اور سارا زور اُسے ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، دجال، مرتد اور کافر ثابت کرنے میں صرف فرما رہے تھے۔ اس میں ہر فرقہ کے مولوی صاحبان شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب

کفر کے فتوے

فتویٰ پر چونٹی کے ساٹھ مولویوں کی مہروں اور دستخطوں سے سرسیدؒ کی تکفیر پہ اجماع ہو گیا تو پھر یہ حضرات یہاں سے بھاگے بھاگے مکہ معظمہ پہنچے تاکہ حرمین شریفین کی مہروں سے فتوے کی محکمیت کو اور زیادہ ثبت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فرما دیا کہ:۔

> یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی طرف مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور اُن گمراہیوں سے رجوع کیا اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔

سرسیدؒ، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر، کوچہ بکوچہ، قوم کا دردِ دل میں لئے، اس کی زندگی اور فلاح و بہبود کے لئے دیوانہ وار پھرتا تھا اور یہ "حامیانِ شرعِ متین اور مفتیانِ دینِ مبین" کفر کے فتوؤں کا انبار اٹھائے، اس کے پیچھے لگے رہتے اور لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ اگر نجات چاہتے ہو تو اس شخص کی کوئی بات نہ سننا۔ اس کے جواب میں سرسیدؒ کیا کہتا، سنیئے۔

ایک مرتبہ وہ اسی تکفیر کے ہنگاموں اور گالی گلوچ کے حالات میں علی گڑھ مدرسہ کی تعمیر کے سلسلے میں لاہور آیا تو ایک اجتماعِ عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا:۔

فتوے کا جواب

> اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو آپ اُسے اپنا خادم اور خیرخواہ نہیں

سمجھیں گے ، آپ کے لئے دولت سرا بنانے ہیں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے آرام پاتے ہیں۔ یا آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ جہاد۔ قلی۔ کافر۔ بت پرست۔ بدعقیدہ۔ سب مزدور کام کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ (علی گڑھ) کے قائم کرنے میں ایک قلی اور جہاد کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔

سرسیدؒ کی یہ ساری کوششیں کس مقصد کے لئے تھیں؟ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ـــــ جو بکھرے ہوئے تنکوں کی طرح فضا میں منتشر تھے پھر سے شیرازہ بندی کی جائے تاکہ وہ اس ملک میں قائم بالذات اور مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کو یہ حیثیت دینے کے لئے نہ انگریز تیار تھا نہ ہندو رضامند۔ انگریز انہیں ایک باغی مذہبی فرقہ تصور کرتے تھے اور ہندو انہیں اچھوت قرار دینے کے درپے تھے۔ لیکن سرسیدؒ نے ان دونوں کے علی الرغم، اعلانیہ کہہ دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

دو الگ قومیں

اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے اُبھرے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔

سرسیدؒ نے یہ الفاظ (۱۸۶۷ء میں) بنارس کے کمشنر، مسٹر شیکسپئر کے سوال کے جواب میں کہے تھے۔ ـــ پاکستان کی بنیاد اس نظریہ پر استوار ہوتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اس لئے ان کی مملکتیں بھی الگ الگ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ اعلان، اس بنیاد کی پہلی اینٹ ہے، جو آج سے سو سال پہلے سرسیدؒ کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اس اینٹ کو رکھتے ہوئے اس نے دارالعلوم کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

پاکستان کی پہلی اینٹ

یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔

یہ تھا پاکستان کا معمار اول ـــ سرسیدؒ ـــ جس پر یہاں سے لے کر مکہ معظمہ تک کے علمائے کرام نے کفر و لحا

کے فتوے لگائے تھے۔ سوچئے کہ اگر قوم اس وقت ان فتوؤں کا اثر قبول کر لیتی تو ہم گنہگار تو ایک طرف، خود اس مقدس طائفہ کی اولاد کا کیا حشر ہوتا؟ ان میں سے کوئی بھی عبد اللہ اور عبد الرحمٰن نہ ہوتا ــــ سب لالہ گردھاری مل یا مسٹر فضل مسیح ہوتے۔

سرسیدؒ نے آنکھیں بند کیں تو اس شمع کو سیالکوٹ کے ایک نوجوان کے سپرد کر دیا، جو اس زمانے میں ہنوز

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا!

اقبالؒ

کا وطنی ترانہ گایا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ یورپ گیا اور وہاں وطنیت یا قومیت (نیشنلزم) کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس پر قرآنِ کریم میں بیان کردہ یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ قومیت کی بنیاد مشترکہ آئیڈیالوجی (یا ایمان) ہے۔ وطن کا اشتراک نہیں۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے واپس آیا تو اس کی زبان پر ــــ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا ــــ کی جگہ یہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

تھا۔ اس زمانے میں یہاں قومیت پرستی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے کہ یہ تصور، ہندو اور انگریز دونوں کے لئے مفید تھا۔ اقبالؒ کی نگاہ دوررس نے، مسلمانوں کے لئے اس عظیم خطرے کو بھانپا اور جو بات سرسیدؒ نے پچاس سال پہلے مجملاً کہی تھی اسے شرح و بسط کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ اس نے نظریۂ وطنیت کے فریب خوردہ مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو!

مسلم قومیت کا معیار

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اور اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا، توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

وہ یومِ اول سے اپنے آخری سانس تک اسی پیغام کو دہراتا چلا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ فضا اس سے متاثر

پاکستان کا اوّلین تصوّر

ہو گئی ہے تو اس نے، الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ

قوم ہے اس لئے اس کی مملکت بھی الگ اور آزاد ہونی چاہیئے تاکہ یہ اس میں قرآن کے احکام و قوانین کو ایک زندہ حقیقت کی طرح نافذ کر کے صحیح اسلامی زندگی بسر کر سکے۔

حضرات علمائے کرام نے اقبالؒ کے خلاف پہلے ہی کفر کے فتوے صادر کر رکھے تھے، اس اعلان نے گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دیا۔ قومیت پرست علماء نے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔ وطن کے اشتراک پر ہندو اور مسلم کی متحدہ قومیت کے جواز میں بزعم خویش "خدا و رسولؐ کے ارشادات" پیش کئے جانے لگے۔ اس طائفہ کے سرخیل۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے برملا کہا کہ:-

اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں

مولانا حسین احمد مدنیؒ

چونکہ یہ الفاظ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی زبان سے نکلے تھے اس لئے ان سے اقبالؒ کے دل پر چھری چل گئی۔ اس کے سینہ پر سوز سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی جس نے ان زندۂ جاوید اشعار کی شکل اختیار کر لی کہ:-

عجم ہنوز نداند رموز دیں، ورنہ
ز دیوبند حسین احمدؔ! ایں چہ بوالعجبی است؟
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی۔ تمام بولہبی است

اس کے بعد مولانا مدنی کے جواب پر انہوں نے جو بیان شائع کیا وہ اس موضوع پر گویا حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

علامہ اقبالؒ کا یہ خدشہ کس قدر صحیح تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں اسرار احمد آزاد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا جس کی جلی سرخی یہ تھی کہ:-

یہ الزام غلط ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنتِ اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے اور نفسِ مضمون میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ:-

> دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔ (طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۶۳ء)

اور یہی تھی ہندوستان کی سیکولر جمہوری حکومت جس کے لئے "نیشلسٹ علماء" معروف جہاد تھے اور جس کے خلاف علامہ اقبالؒ نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

اور اس کا خاتمہ انہوں نے ان الفاظ پر کیا کہ :-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادئ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کو اس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ پھر بستر سے اٹھ ہی نہ سکے۔ اور اس کے چند ہی روز بعد ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن پاکستان کی بنیاد کی جو اینٹ سرسیدؒ نے رکھی تھی وہ اسے اپنی عمر بھر کی محنتِ شاقہ سے اتنا اونچا لے گئے کہ اس پر گویا چھت ڈالنا باقی رہ گیا۔ کیسے عظیم تھے پاکستان کے یہ معمار اور کتنا بڑا ہے ملتِ اسلامیہ پر ان کا احسان۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبالؒ کے بعد

مرتے وقت یہ شمع کس کے ہاتھ میں دینی ہے، علامہ اقبالؒ کی نگاہِ حقیقت بین نے اس کا انتخاب بہت پہلے کر لیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس ہجوم میں ایک مردِ راہ بیں ایسا ہے جس کے سپرد یہ امانت نہایت اطمینان اور وثوق سے کی جا سکتی ہے۔ یہ تھے مسٹر محمد علی جناحؒ بار ایٹ لا۔ جنہیں ملت کی متحدہ آواز نے قائداعظمؒ کہہ کر پکارا۔ اور انہوں نے اپنی بے لوث خدمت، بے پناہ محنت اور بلند ترین کیریکٹر سے ملت کے اس اعتماد کو سچ کر دکھایا۔

سرسیدؒ نے سن ۱۹۶۷ء میں بنارس کے کمشنر سے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور دونوں دل سے کسی کام میں اشتراک نہیں کر سکتیں۔ اقبالؒ نے سن ۱۹۰۶ء میں کہہ دیا تھا کہ ——— بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ——— اور جناحؒ نے اب مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد اس دعوے پر رکھی کہ :-

قائداعظمؒ

ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (ایڈورڈس کالج پشاور کی تقریر ۲۴ نومبر سن ۱۹۴۵ء)

اس سے پہلے انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔

اس سے دو ہفتہ پہلے (۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو) انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک اہم تقریر کی۔ اس میں سوال زیرِ نظر یہ تھا کہ پاکستان کے تصور سے مطلب کیا ہے؟ یہ بکا یک سامنے کیسے آ گیا؟ ان سوالات کے جواب میں قائداعظمؒ نے دو فقرے کہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو فقروں میں پاکستان کے مطالبہ کی ساری تاریخ سمٹا کر رکھ دی۔ آپ نے فرمایا:-

پاکستان کب وجود میں آیا تھا؟

پاکستان اُس دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا، یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

آپ نے غور کیا کہ کتنی عظیم حقیقت ہے جسے ان چند الفاظ میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ جس دن پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا اس دن ایک جداگانہ قوم وجود میں آ گئی تھی، اور یہی چیز مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ الفاظ کس کی زبان سے نکل رہے تھے؟ اس مسٹر جناحؒ کی زبان سے جو ابھی کل تک بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ:-

I AM NATIONALIST FIRST NATIONALIST SECOND & NATIONALIST LAST.

قائداعظمؒ اس کا اعلان پر اعلان کرتے جا رہے تھے اور اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام چاروں طرف سے یورش کر کے ان کی مخالفت میں امنڈتے چلے آ رہے تھے۔ اُن کا مسلک یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر محض ایک وطن کے باشندے ہونے کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور یہ تصور باطل ہے کہ

علماء کی طرف سے مخالفت

اسلام کو ایک زندہ حقیقت بننے کے لئے آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے جس میں حکومت، قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وہ کہتے تھے کہ سیکولر انداز کی جمہوری حکومت، جس میں غیر مسلم (ہندو) اکثریت قانون وضع کرے، عین مطابق اسلام ہے۔ بس اتنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء (شخصی قانون) یعنی نکاح طلاق وغیرہ سے متعلق معاملات علمائے کرام کے ہاتھ میں رہیں۔ وہ تھا مسٹر جناحؒ کا دعویٰ اور یہ تھا حضرات علمائے کرام کا مسلک۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تعجب انگیز اور تاسف خیز تماشا شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو کہ ڈاڑھی مونچھ منڈا، سوٹ بوٹ میں ملبوس، مغرب کا تعلیم یافتہ مسٹر جناحؒ، مسلمانوں سے یہ کہہ رہا ہو کہ:-

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی

حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔
(۱۹۴۵ء میں عید کا پیغام)

مولانا آزاد مرحوم

اور اس کے برعکس امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) مسلمانوں کو اس کانگریس میں شرکت کی دعوت دیتے تھے جس کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تھی ــــ مہاتما گاندھی کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ:-

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔
(خطبۂ صدارت۔ پرتاب گڑھ کانگریس)

یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کرتا تھا کہ:-

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں اور اپنشدوں کے پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں۔ اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔
(بحوالہ خطبۂ صدارت قائداعظمؒ مسلم لیگ سیشن دہلی۔ اپریل ۱۹۴۳ء)

مسٹر جناحؒ نے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ:-

وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اور پھر خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ:-

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک امت۔
(لیگ سیشن کراچی ۱۹۴۳ء)

اس کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) فرماتے تھے کہ:-

یہ تخیل کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں ــــ ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔
(خطبۂ صدارت۔ پرتاب گڑھ کانگریس)

اور اس کے بعد وہ سینے کے پورے زور سے اعلان کرتے تھے کہ:-

میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ (ایضاً)

یہ وہی مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو کسی زمانہ میں کہا کرتے تھے کہ:-

دورِ الہلال کے ابوالکلام آزاد

انسان کی اجتماعی حیات اور قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ انبیائے کرامؑ کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:-

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو خواہ الجیریا کا وحشی ہو خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے۔ اس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا...... پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام، رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں...... انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔

وہ ابوالکلام آزاد جو اپنے دورِ الہلال (۱۹۱۲-۱۶ء) میں یہ کہتا تھا، اب کیا کہہ رہا تھا، اسے برادرانِ عزیز! ذرا کلیجہ تھام کر سنئے۔ مولانا آزاد اپنی اس کتاب میں جو اُن کی زندگی کا آخری کارنامہ تھا (اور جو شائع ان کی وفات کے بعد ہوئی تھی) لکھتے ہیں:-

مولانا آزاد کے آخری الفاظ

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یگانگت اور وحدت پیدا ہو سکتی ہے بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری متشکل کرنی چاہی تھی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آئے لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔

(INDIA WINS FREEDOM. P.227)

استغفراللہ، استغفراللہ۔ مولانا آزاد کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی، لیکن وہ تجربہ ناکام رہا۔ اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ :-

> یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے ...... دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

بہرحال وہ تھی مسٹر جناح کی دعوت اور یہ تھی ہمارے علمائے کرام کی حالت۔ ہم نے اس باب میں، مولانا آزاد (مرحوم) کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ یہ قومیت پرست علماء کے امام تھے۔ ورنہ، باقی حضرات بھی مسلمانوں کی الگ مملکت کے مطالبہ کی مخالفت میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن یہ خدا کا بندہ تھا کہ مخالفتوں کے اس تمام طوفان میں روشنی کے مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ اور اپنے مبنی بر صداقت مطالبہ کی نور پاشیوں سے باطل کی تاریکیوں کو ہٹاتا اور مٹاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی مسلسل جدوجہد اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا جسے اس نے (مارچ ۱۹۴۴ء میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس میں) تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا کہ :-

پاکستان کا پختہ تصوّر

> پاکستان کے تصور کو جو اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ اسی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔

پھر انہوں نے (۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو) فرنٹیئر مسلم لیگ پشاور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

> مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

جون ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا :-

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

مسٹر جناح اپنی اس پکار کو برابر دہراتے جا رہے تھے اور مولوی حضرات اسلامی حکومت کے اس مطالبہ کی مخالفت میں دن بدن تند و تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے اس سے پہلے ان کی مخالفت کے جس گوشے کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق نیشنلسٹ علما اور اس ملک کی داعی دیگر جماعتوں سے تھا۔ مثلاً جمعیت العلماء ہند، مجلس احرار۔ آزاد مسلمان۔ انصار۔ سرخپوش وغیرہ۔ لیکن ان کے علاوہ ایک گوشہ اور بھی تھا جس کی طرف سے

جماعتِ اسلامی

مخالفت کا انداز ہی نرالا تھا۔ یہ تھی جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب! یہ متحدہ قومیت کے بھی مخالف تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مطالبۂ پاکستان کے بھی دشمن۔ اس عداوت میں یہ حضرات نیشنلسٹ علماء سے بھی دو قدم آگے تھے۔ آپ نے ان چند اقتباسات سے، جنہیں پہلے پیش کیا گیا ہے، دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے کس طرح صاف، مبین اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا ——— اور بہ تکرار و اصرار واشگاف کرتے چلے گئے کہ پاکستان سے مراد ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام ہے جس میں قوانینِ اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن مودودی صاحب یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس مطالبہ کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کے "جہادِ عظیم" میں مصروف تھے کہ:۔

غلط بیانی

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۱ھ صفحہ ۲۷۔ فٹ نوٹ)

آپ نے غور فرمایا کہ ان تمام اعلانات اور بیانات کی موجودگی میں جو مسلم لیگ کے دوسرے درجہ کے لیڈر تو ایک طرف، ——— خود علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اور ہوتے چلے جا رہے تھے، یہ کہنا کہ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے، کس قدر دیدہ دلیری ہے!

اور آگے بڑھیے۔ ان کی آتشِ حسد اسی سے ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

مسلمانوں کی کافرانہ حکومت

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو۔ اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوگا وہ <u>مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔</u>

(ایضاً صفحہ ۲۹)

جب ان سے کہا جاتا کہ اس وقت ہندو اور انگریز سے جنگ اس بات پر ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں یہ آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ جب یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے گا تو اس میں مسلمانوں کو یہ اختیار و اقتدار حاصل ہوگا کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ اگر آزاد خطۂ زمین ہی نہ ملا تو اسلامی حکومت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے:۔

ناممکن ہے

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح

کے ذریعہ اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ — سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ایضاً ص۶۰)

یہ سب قرآن سے بے بہرہ ہیں

یہ تو رہی ان کی مخالفت، مطالبۂ پاکستان کی۔ اب یہ سنیئے کہ یہ صاحب، اس مطالبہ کو پیش کرنے والوں کے متعلق کیا فرماتے تھے۔ وہ کہتے تھے:۔

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ (مطبوعہ ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۴۱)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ خیال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔ (ایضاً ص۲۷۴)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اسے چھوٹے سے چھوٹے مسائل تک میں بھی قرآن کا نقطۂ نظر معلوم نہیں! اس شخص (قائدِ اعظمؒ) کے متعلق جس کی قرآن کریم کے حقائق پر غائر نگہی

قائدِ اعظمؒ کی قرآنی بصیرت

کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب وہ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ سنیئے کہ سوالات اور ان کے جوابات کیا تھے؟

انہوں نے پوچھا: مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

قائدِ اعظمؒ نے جواب دیا:۔

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق، لامحالہ، میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصوّر نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی

ہونا چاہئے تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظام کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔

(تجدید و احیاء دین)

یہ تنقید یا تنقیص بلاواسطہ تو حضرت عثمانؓ کی ہے لیکن بالواسطہ اس کی زد میں تمام صحابہؓ آ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام کے استحکام کی ذمہ داری تنہا حضرت عثمانؓ (خلیفہ) کے سر پر نہیں تھی ——— (قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق) مملکت کا جملہ نظم و نسق صحابہؓ کی مشاورت سے سرانجام پاتا تھا اس لئے اگر اس میں جاہلیت (یعنی زمانہ قبل از اسلام کے کافرانہ نظام) کے گھس آنے کے راستے کھل گئے تھے تو اس کی ذمہ داری تنہا خلیفہ پر نہیں بلکہ جملہ صحابہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت، حضورؐ کی وفات کے صرف بارہ تیرہ سال بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لئے اس وقت وہ "مہاجرین و انصار" موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے السابقون الاوّلون سے تعبیر کیا، اور مومنِ حقہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہی حضرات (رضی اللہ عنہم) شجرِ طیب رسالتمآبؐ کے ثمراتِ اوّلین تھے ——— اور ان کی (بقول مودودی صاحب) یہ حالت تھی! (پناہ بخدا)

مودودی صاحب کی یہ تنقید تو حضرت عثمانؓ کے نظامِ مملکت کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں تھی۔ اب ان کے ذاتی کردار کی طرف آیئے۔ لکھتے ہیں:-

لیکن جب ان کے (شیخینؓ کے) بعد حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو وہ رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے گئے (جس پر رسول اللہؐ اور اوّلین دو خلفاء کاربند چلے آ رہے تھے۔) انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص۱۰۶)

مودودی صاحب (اور ان کی جماعت) کی طرف سے موجودہ (بلکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک کے) برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جاتی ہے اس میں اقربا نوازی اور خویش پروری، سرِفہرست ہوتی ہے۔ آپ دیکھئے کہ یہ صاحب کس دھڑلے سے حضرت عثمانؓ کو اسی جرم کا مرتکب قرار دیتے ہیں؟ اپنے جن اقربا کو حضرت عثمانؓ نے اس طرح نوازا تھا، ان کا ذاتی کیریکٹر کس قسم کا تھا، اس کے متعلق مودودی صاحب ولید بن عقبہ کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

حضرت عثمانؓ نے انہیں کوفہ جیسے اہم صوبہ کا گورنر بنا دیا۔ وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا۔ "اور پڑھاؤں"؟ (ص۱۱۲)

یہ ہے حضرت عثمانؓ کا کردار جسے یہ صاحب اس جرأت و بےباکی سے پیش فرماتے ہیں اور اس سے قطعاً

کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی

قرآنی مملکت

ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کیلئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کیلئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصّہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا: اسلامی حکومت کے تصوّر کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی اور نہ کسی

صرف قرآن کی اطاعت

اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ تھا مخالفتوں کا وہ ہجوم، جس میں یہ نحیف و زار سا مرد مجاہد، قوم سے ایک پیسہ لئے بغیر پاکستان کی چومکھی لڑائی تنہا لڑ رہا تھا۔ اور اس کی مخالفت کی یہ کیفیت تھی کہ یہ لوگ سنجیدگی اور متانت کو بالائے طاق رکھ کر، بازاریت کی پست ترین سطح پر اتر آئے تھے۔ اس سطح پر ان کے طنز و استہزاء کی کیفیت کیا ہوتی

استہزاء

تھی، اس کا اندازہ، جماعت اسلامی کے ایک رکن رکین، نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے ایک صحافتی شاہکار سے لگائیے، جو ان کے اخبار "کوثر" کی ۱۳ر جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

اور اس عنوان کے نیچے لکھا تھا:۔

اس زمانہ میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انہوں نے اپنی زمین پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اخبار خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا ـــــ ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی ـــــ بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوتی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ۔ کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ مہدی علیہ السلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدۂ خیال میں نکل رہا تھا۔ آخرکار نتیجہ خیز ہوا۔ اور مسٹر جناح نے اپنی درخواست قوم کے حضور میں گزران دی قوم نے

باقی سب امیدواران قیادت کو برخاست کر دیا اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔
اور قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ (بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۳۶)

یہ جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ قائداعظمؒ طنز و استہزاء اور تحقیر و تذلیل کے ان تیروں کو بھی اپنے سینے پر لیتے، اور انتہائی ضبط و استقلال سے اپنے دل میں سمو لیتے تھے۔ انہیں اس کی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ ان خاردار جھاڑیوں میں اپنا دامن الجھائیں۔ وہ، جس کے دامن پر اسلامیت کی کوئی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی تھی، ان سرتاپا قدم "اسلامی بیکروں" سے بہت اونچا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مستانہ وار آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں اسے منزل قریب نظر آ رہی تھی ان کے ذوق سفر میں اور تیزی اور تازگی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی جذب و انہماک سے اپنے لیے سروسامان قافلہ کو لئے آگے بڑھتا گیا۔ تا آنکہ اگست ۱۹۴۷ء میں منزل نے خود آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے۔ اور اس نے، انگریز۔ ہندو اور خود مسلمانوں کے مزعومہ علمبرداران اسلام و شریعت کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، اپنے کارواں کو سرزمین پاکستان میں آن اتارا۔

پاکستان بن گیا

اور اس طرح جس عمارت کی پہلی اینٹ، سرسیدؒ کی نگہ دوربین نے رکھی تھی اور جس کی دیواریں اقبالؒ کی قرآنی فکر نے اوپر اٹھائی تھیں، وہ قائداعظمؒ کی بصیرت و کردار کے صدقے تکمیل تک پہنچ گئی ——— فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

قائداعظمؒ نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ ایک خطۂ زمین کا حصول، ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی مملکت کا قیام، چنانچہ انہوں نے اس خطۂ زمین پر قدم رکھنے کے بعد، اپنے رفقاء کو وضاحت سے سمجھا دیا کہ وہ کہیں اسی کو مقصود و منتہیٰ سمجھ کر آرام سے نہ بیٹھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں (خالق دینا ہال۔ کراچی میں) عمال حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ خطۂ زمین مقصود بالذات نہیں

پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں۔ اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

اسلام کا عدلِ عمرانی

اسلام کے عدلِ عمرانی کے وہ اصول کیا ہیں جنہیں بروئے کار لانے کے لئے، قائداعظمؒ کے الفاظ میں اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ اسلامی نظام کا منتہیٰ یہ ہے کہ ہر فرد کی تمام مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس طرح ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں اور اس کے بعد کی زندگی میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ سب سے پہلے افراد

مملکت کو ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے فکر کر دیتا ہے تاکہ وہ اطمینان سے بلند مقاصدِ زندگی کے لئے جد و جہد کر سکیں۔ وہ تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ "ہم خدا کی طرف سے تمہاری اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لیتے ہیں۔" اس کا نام اسلام کا عدلِ عمرانی ہے۔ اس مقصد کے لئے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں قائدِ اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔

مسلمانوں کے افلاس کا علاج

> سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اس سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے، جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ شروع میں تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مملکت نے اپنا (اسٹیٹ) بینک کھولا، تو جولائی ۱۹۴۸ء میں اس کے افتتاح کی تقریب، قائدِ اعظمؒ کے ہاتھوں سر انجام پائی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے جو تقریر فرمائی (اور میرا خیال ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں کہا کہ:-

> ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے، اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے گا اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

لیکن ظاہر ہے کہ جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری کی موجودگی میں، اسلام کا یہ معاشی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ملک کے بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن

قائدِ اعظمؒ انہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہو گی؟ انہوں نے تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے سنہ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی کے سیشن میں، برملا اعلان کیا کہ :۔

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی پیداوار ہیں، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصد ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

قائدِ اعظمؒ پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی متشکل کرنے کی تدابیر پر غور و فکر میں مصروف اور منہمک تھے کہ دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ وہی لوگ جو مسلسل دس برس تک مطالبۂ پاکستان کی اس شدت سے مخالفت کرتے رہے تھے، فوج در فوج پاکستان کی طرف اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ چشمِ عبرت حیران تھی کہ یہ حضرات اب کس منہ سے ادھر آ رہے ہیں۔

مخالفینِ پاکستان، پاکستان کی طرف

خود قائدِ اعظمؒ بھی تعجب انگیز نگاہوں سے اس ریلے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کی مخالفت کی آگ، ان کی دشنام طرازیوں کی بوچھاڑ، ان کی طنز اور استہزاء کے تیروں کی بارش، ایک ایک کر کے پردۂ سیمیں کی طرح ان کی نگاہوں کے سامنے آ رہی تھی۔ دنیا منتظر تھی کہ اب دیکھیں قائدِ اعظمؒ کی طرف سے ان کے تیر و سنان کا کیا جواب ملتا ہے۔ وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ وہ جس پر چاہتے یہاں کا دروازہ بند کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بلند سیرت انسان کی طرح دل کی پوری کشادگی سے کام لیا اور جس طرح نبی اکرمؐ نے مخالفینِ مکہ سے، جو فتح مکہ کے بعد پابجولاں سامنے کھڑے تھے، فرمایا تھا، ہاتھ کی پوری جنبش سے کہہ دیا کہ :۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔

وسعتِ ظرف

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (۳/۹۷) جو یہاں آئے گا، اسے امن حاصل ہو گا۔ انہوں نے اس وسعتِ ظرف کا ثبوت دیا، اگرچہ بعض کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ کشادہ نگہی پاکستان کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو گی۔ جو لوگ ابھی، واہگہ سے اُس پار تک، پاکستان اور بانیٔ پاکستان کو مسلسل گالیاں دیتے رہے تھے، وہ اس حد کو پار کرنے کے ساتھ ہی کس طرح پاکستان کے بہی خواہ ہو سکتے ہیں؟ ایسا کہنے والوں کے سامنے قرآن کریم کا وہ فیصلہ بھی تھا جو اس نے ان اعراب (قبائلی بدوؤں) کے سلسلے میں دیا تھا۔ جو عمر بھر اسلامی نظام کی مخالفت کرتے رہے تھے، لیکن جب اسلام کا

غلبہ ہوگیا تو وہ اُس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگئے اور اپنا شمار مومنین کی صف میں کرنے لگے۔ اس پر قرآن نے کہا تھا کہ:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا ۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ...... (۴۹/۱۴)

یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم صرف غلبۂ اسلام کے سامنے جھک گئے ہو۔ ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بعد کے واقعات نے بتا دیا ــــ اور اب تک بتاتے چلے آ رہے ہیں، کہ جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان کے دل میں فی الواقعہ پاکستان کی محبت جاگزیں نہیں ہوئی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ــ کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو ــــ یہاں رہنے میں انہیں اپنے مفاد نظر آتے ہیں، اس لئے وہ پاکستانی ہیں۔ اس کے خلاف انتقام کی چنگاریاں اب بھی ان کے سینوں میں سلگ رہی ہیں۔ ان کی کیفیت، یہ ہے کہ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۔ (۳/۱۱۷) اس بغض و عداوت کے مظاہرے کبھی کبھی ان کی زبان سے ہو جاتے ہیں، لیکن جو ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کو "مقدسین" کے اس طائفہ کے عزائم کا علم و احساس تھا، اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں ان کی آئینی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا جس میں کہا کہ:۔

> پاکستان کا قانون ساز اسمبلی کو ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی؛ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت، مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

تھیاکریسی نہیں ہوگی

لیکن قوم کی بدقسمتی، (اور ان حضرات کی خوش بختی) کہ قائدِ اعظمؒ، آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے اور ان کے بعد کوئی ایسا مدبر نہ رہا جو انہیں ان کی حدود کے اندر رکھتا۔ چنانچہ یہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ آپ کو یاد ہے کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا کہ:۔

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات

آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر، پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

اب انہیں مودودی صاحب نے پاکستان کے عوام سے کہنا شروع کر دیا کہ:-

جھٹ بدل گئے

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سکھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(دستوری سفارشات پر تنقید صٓ)

یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ حضرات یومِ تشکیلِ پاکستان تک، پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت میں کس طرح ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔ لیکن اب بلاجھجک یہ کہنا شروع کر دیا کہ:-

ہم نے پاکستان حاصل کیا

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

(ترجمان القرآن - اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء)

مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں

آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے یہ مربی و محسن، جو یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے اس قدر کوشش کی تھی" کون بزرگوار ہیں! یہ وہی حضرت ہیں جو تحریکِ پاکستان کے دوران میں اعلانیہ کہہ رہے تھے کہ:-

اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دینی کی حیثیت سے اپنا علیٰحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ (ترجمان القرآن - بابت ذوالحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ)

یہ ہیں وہ جو آج دعوے کر رہے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے قومی وجود کا تحفظ کیا تھا! باقی رہا ان کا یہ دعوےٰ کہ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تھا تو اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ:-

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

یہ آخری وقت تک اس مملکت کے قیام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے تھے۔

یہ ہے برادران! وہ پاکستان جو سرسیدؒ کے اخلاص و جہاد، اقبالؒ کی آہِ سحرگاہی و نالۂ نیم شبی اور جناحؒ کی بصیرت و کردار سے قریب اسّی سال کی محنتِ شاقہ سے تعمیر ہوا اور یہ ہیں وہ لوگ جو آج یہ تک کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے کہ "نظریۂ پاکستان مودودی صاحب نے دیا تھا" (میاں طفیل محمد) اور جناحؒ (معاذ اللہ) فریب کار اور مکار تھا۔۔۔! (مودودی)

کمیونسٹوں کی طرف سے پروپیگنڈہ

جماعتِ اسلامی کے علاوہ آجکل کمیونسٹوں کی طرف سے بھی جھوٹا پروپیگنڈہ عام کیا جا رہا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا اور کبھی یہ کہ قائداعظمؒ سوشلزم کے حامی تھے۔ اس موضوع پر تفصیل سے لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر ہم دو چار اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) کے طلباء کے ساتھ، قائداعظمؒ کی گفتگو کے کچھ حصے پہلے درج کئے جا چکے ہیں۔ ایک سوال یہ بھی تھا۔

اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا:۔

> اشتراکیت، بالشویت، یا اس قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا ربط و تناسب نہیں پایا جاتا۔

پھر انہوں نے، آل انڈیا مسلم لیگ کے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء میں، اپنے خطاب کے دوران فرمایا:۔

> میں دیکھ رہا ہوں کہ (کانگریس کے علاوہ) ایک اور، سب سے زیادہ ہلاک، جماعت جو ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کر رہی ہے، کمیونسٹ ہیں۔ انہوں نے بہت سے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں ۔۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جھنڈوں کی تعداد کی کثرت میں عافیت ہے۔ (قہقہہ) ان کے ہاں سرخ جھنڈا ہے۔ روسی جھنڈا ہے۔ بالشویکی جھنڈا ہے۔ کانگریس کا جھنڈا ہے۔ اور اب وہ (خیر سے) ہمارا جھنڈا بھی ساتھ رکھ رہے ہیں۔ (قہقہہ) جب کوئی شخص بہت سے جھنڈے اٹھائے ہوئے تو میں اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتا ہوں۔ (تقاریر جناح۔ جلد دوم۔ صـ۴۲)

انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین سے، ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> اب کچھ دنوں سے ایک پارٹی بہت متحرک ہو گئی ہے۔ وہ ہیں کمیونسٹ ۔۔۔۔ ان کا پراپیگنڈہ بڑا پُرفریب ہے اور میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ ان کا پراپیگنڈہ دامِ ہمرنگِ زمین ہے۔ ایک خطرناک پھندا ہے۔ وہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنل سوشلزم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو! ہمارے ہاں ان "ازمز" یا اس قسم کی کسی اور ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ (تقاریر جناح۔ جلد دوم۔ صـ۷۵)

پھر انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس، منعقدہ ۱۹ر مارچ ۱۹۴۴ء کے آخری اجلاس میں فرمایا
یہ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں۔ ان کے اس قسم کے مغالطہ میں رہنے کے لئے کچھ وجہ جواز ضرور ہے لیکن (یہ قصۂ ماضی ہے) گذشتہ پانچ دس سال میں مسلمانوں میں ایسی تبدیلی آچکی ہے کہ کمیونسٹ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر انہوں نے پھر سے وہی کھیل کھیلنا چاہا تو انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا جائے گا (جسے وہ یاد رکھیں گے) ہم مسلم لیگ کے ہلال اور ستارہ کے پرچم کے سوا کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہمارا راہ نما بھی ہے اور مکمل ضابطۂ حیات بھی۔ ہم کوئی زرد یا سرخ جھنڈا نہیں چاہتے۔ ہم کوئی ازم بھی نہیں چاہتے۔

(بحوالہ نوائے وقت، مورخہ ۲۳ر اپریل ۱۹۷۶ء)

اس قائداعظمؒ کو اب کمیونسٹ کہا جا رہا ہے! ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے!

باقی رہے علامہ اقبالؒ، تو انہوں نے اپنی بصیرت فرقانی کی رو سے، واضح الفاظ میں بتایا کہ کمیونزم یا سوشلزم، اسلام کی نقیض ہیں، اور کوئی مسلمان، کمیونسٹ یا سوشلسٹ نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے۔ کسی صاحب نے لکھ دیا کہ اقبال کمیونسٹ ہے۔ انہوں نے بلا تاخیر، اس کی تردید روزنامہ زمیندار میں شائع کی، اور اس ضمن میں فرمایا۔

میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیال رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مرادف ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(علامہ اقبالؒ کا خط۔ مطبوعہ زمیندار، مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء)

یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے پھر انہوں نے، اپنی زندگی کے آخری دو سال (۱۹۳۶ء میں) فرمایا۔
سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔

(خواجہ غلام السیدین کے نام، علامہ اقبالؒ کا خط۔ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آپ نے دیکھا کہ بہتان تراشی اور افترا پردازی میں، جماعت اسلامی اور کمیونسٹ کس طرح دوش بدوش چلتے ہیں!

یہ ہے جو کچھ آج معماران پاکستان کے خلاف ہو رہا ہے۔

مایوسی کی کوئی بات نہیں

لیکن اس میں عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ــ نہیں ــ مشیت کے جس پروگرام نے سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ جیسی شخصیتوں کو ایک دوسرے کے تسلسل میں پیدا کر دیا تاکہ وہ اس قوم کو جسے اغیار کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی غداریاں، مٹا دینے یا شودر بنا دینے کا تہیہ کر چکی تھیں، ایک عظیم مملکت کا وارث بنا دے۔ وہی پروگرام اب یہ انتظام بھی کرے گا کہ یہ متاعِ ملی ہر رہزن کی دستبرد سے محفوظ رہے۔ اب پھر ایک سیمرغ پیدا ہوگا جو اپنی شعلہ نوائی سے، اس نشید جانفزا کو فضائے کائنات میں عام کر دے گا کہ باطل کی قوتیں سرنگوں ہوں گی اور اس خطۂ پاک میں ایک بار پھر وہی قرآنی نظام جلوہ بار ہوگا جو چودہ سو سال پہلے سرزمینِ حجاز میں وجہ بالیدگی شرفِ انسانیت ہوا تھا۔ اور جس نے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، الحاد اور سرمایہ داری کی ہر اس زنجیر کو توڑ کر رکھ دیا تھا جس میں نوعِ انسان صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی تھی ــ سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ کی بے صوت صدائیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا سے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود! پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ولو کرہ المشرکون

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اگر (خدا نہ کردہ) یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا، تو اسلامی مملکت قائم کہاں ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان عناصر پر کڑی نگاہ رکھی جائے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اور جو آج بھی اس کے مٹانے کے لئے ہر ممکن سازش میں مصروف ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس مقصد کو عام کیا جائے جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ جس قدر یہ خیال عام ہوگا اسی قدر اس مقصد کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ تحریک طلوعِ اسلام کا مشن یہی ہے۔

والسلام

شاھد عادل

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا

جشنِ تاسیس

(فکر و نظر کے یومِ تاسیس نمبر پر ایک نظر)

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، کی طرف سے اس کے پندرھویں یومِ تاسیس پر جشن منایا گیا۔ اس کے ایک حصے، یعنی کتابوں کی نمائش کے بارے میں اس کی کارکردگی کی ــــــ ایک جھلک طلوعِ اسلام کے گزشتہ شمارے میں قارئین کے سامنے آچکی ہے۔ اب ہم اس ادارہ کے اصلی کام پر نظر ڈالتے ہیں جس کے لئے اس کی تشکیل کی گئی تھی۔ اس موقع پر، اپنے اس اصلی کام کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے ادارہ نے اپنے ترجمان، ماہنامہ فکر و نظر، کا ایک خصوصی شمارہ "یومِ تاسیس نمبر" شائع کیا ہے، جو ڈیڑھ صد سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ادارے نے بیشتر اپنی تعریف بیان کی ہوگی۔ تاہم اس میں کچھ اچھی باتیں بھی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ خود اپنی بیان کردہ اچھی باتوں کی خلاف ورزی پر فخر بھی کیا گیا ہے۔ کچھ باتیں اشاروں کنایوں میں کی گئی ہیں (جن کا تعلق موجودہ حکومت سے بنتا ہے) اور جو باتیں ادارہ کے خلاف جاتی ہیں انہیں فطری طور پر گول مول رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آیئے ان تفصیلات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

ادارے پر اخراجات

آگے چلنے سے پیشتر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیئے کہ اس ادارے پر جسے طلوعِ اسلام نے بجا طور پر سفید ہاتھی، کہہ کر پکارا تھا۔ اس غریب قوم کا کوئی دو کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل پچھلے سال ادارہ کے انچارج وزیر، محترم کوثر نیازی صاحب نے ادارہ کے معائنہ کے موقع پر بیان فرمائی تھی۔

(ملاحظہ ہو ماہنامہ فکر و نظر بابت فروری ۱۹۷۵ء)

امریکہ کے مشہور ادارے، ایشیا فاؤنڈیشن، نے اس ادارے کو ایک اعلیٰ درجہ کا جدید پریس مہیا کرنے اور لائبریری کے لئے جو فنڈ مہیا کئے اور جن کی مالیت لاکھوں ڈالر سے زیادہ ہے وہ اس

کے علاوہ ہیں۔ اس لئے یہ غریب قوم بجا طور پر یہ توقع کرتی ہے کہ معلوم کر سکے کہ اس قدر صرف کثیر کے عوض اس کے پلے کیا ڈالا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادارے کا یومِ تاسیس منایا گیا تھا۔

ادارے کے قیام کی تاریخ

قارئین حیران ہو یہ دیکھ کر ہول گئے کہ ابھی تک اس ادارہ کے اپنے اسکالروں کو صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ ادارہ کا قیام کب عمل میں آیا تھا۔ مختلف حضرات مختلف تاریخیں پیش کرتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان مختلف تاریخوں میں چھ چھ سال کا فرق ہے۔ مثلاً شمارہ زیرِ تبصرہ کے ایک اہم مضمون نگار، برنی انصاری صاحب ہیں جو ادارہ کے سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ اور جن کا تعارف خود اس شمارے میں ان الفاظ میں کرایا گیا ہے کہ برنی صاحب ادارے سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اور ادارے کے ساتھ ان کی دلچسپی آج بھی قائم ہے اس لئے ان کے بیانات ایک واقفِ حال کے بیانات ہیں۔ (صفحہ ۵) وہ اس ادارے کے قیام کے بارے میں فرماتے ہیں۔

> تمام دفتری اور انتظامی مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء میں مولانا عبدالعزیز میمن کا تقرر ادارے کے پہلے منصرم کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ (صفحہ ۵۵)

ہمیں شک گزرا کہ سنہ ۱۹۵۴ء میں کتابت کی غلطی نہ ہو کیونکہ اس طرح تو یہ ادارے کا بائیسواں سال بنتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس شمارے کے سب سے اہم مضمون جس میں ادارے کے اغراض و مقاصد کا تاریخی و تحلیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، کے اوراق الٹے تو یہی تاریخ زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے آئی کہ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء سے مولانا عبدالعزیز میمن کی تقرری سے ادارے کا باقاعدہ آغاز ہوا (صفحہ ۶۷) ادارے کے کتب خانے کے لائبریرین بھی اپنے مقالے میں ادارے کے قیام کی یہی تاریخ بیان فرماتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)۔ لیکن صفحہ ۸۷ پر ادارے ہی کے ایک اسکالر جناب ڈاکٹر احمد حسن صاحب اس کے قیام کا سال سنہ ۱۹۶۰ء بیان کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دو تاریخوں کے درمیان اکٹھا چھ سال کا فرق ہے۔ ادارے کے انچارج وزیرِ محترم کوثر نیازی صاحب بھی، یہی سنہ ۱۹۶۰ء والی تاریخ بیان فرماتے ہیں۔ (صفحہ ۹) ایک عام قاری ان مختلف تاریخوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں ادارے کے قیام کی اصل تاریخ کونسی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا یہ فرض تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ وضاحت فرما دیتے۔ لیکن وہ تو رسالہ کے شروع میں ہی یہ لکھ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں کہ مضامین کے مندرجات کی ذمہ داری مضمون نگار حضرات پر عائد ہوتی ہے۔ یعنی ایڈیٹر صاحب پر رسالہ ایڈیٹ کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں، وہ موصول ہونے والے مختلف مضامین کو ایک دفتری کی طرح اکٹھا کر دیتے ہیں اور معاملہ ختم ——— چاہے ان مضامین میں کتنا ہی تضاد کیوں نہ ہو۔ ان تضادات کی کچھ اور تفصیلات اسی شمارے کے حوالے سے آگے آتی ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ ہم مرحوم صدر ایوب کی اس تقریر کا ایک آدھ اقتباس پیش خدمت قارئین کر دیں جس میں انہوں نے، ۱۳ر جولائی ۱۹۶۰ء کو، ادارہ کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے، خطاب فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

> اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کونسے ہیں اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا، وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن نہ رہے کہ اسلام میں کونسی باتیں غیر متبدل ہیں اور کونسی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ بابت اگست ۱۹۶۰ء)

حقیقت یہ ہے کہ صدر مرحوم نے ان چار فقروں میں اس بنیادی کام کی نشاندہی کر دی جس کے لئے یہ ادارہ وجود میں لایا گیا تھا۔ اگر ادارہ اپنے اس فریضہ کو سرانجام دے دیتا تو یہ بدنصیب ملک اس پریشانی، فکر و نظر کا شکار نہ ہوتا، جس نے اس کی فضا کو اس قدر گرد آلود بنا رکھا ہے اور جس کی وجہ سے پاکستان دشمن عناصر کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا جس پر سب متفق ہو سکیں۔ (معدودی) اس کے بعد صدر مرحوم نے فرمایا تھا کہ:۔

> سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے کام نہ لیں) اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی انہیں انتے صاف الفاظ میں (WARN) کر دیا کہ:۔

> یاد رکھو! بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ جب تک تم ایسی بات نہ کہو جو عقل عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

اور اس ادارہ نے پوری پوری کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو عقل عامہ کو اپیل اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کوئی شخص خود ان کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ کیا عجیب ہے کہ ایشیا فاؤنڈیشن جیسے ادارہ نے اسی مقصد کے لئے اس ادارہ کی اس قدر امداد کی ہو؟

دشمنانِ اسلام کی بے نقابی

زیرِ تبصرہ شمارے کی جو اچھی بات ہمیں پسند آئی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اسلام کے ان دشمنوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اسلامی تحقیق کے نام پر اس میں تدلیس اور تلبیس کرتے ہیں۔ ادارہ کے الفاظ میں :۔

اس وقت اسلامی تحقیقات کا کام ایک تو یورپ اور امریکہ کے یہودی اور عیسائی علماء کر رہے ہیں جن کو عرفِ عام میں مستشرقین کہا جاتا ہے۔ اس فرقے کی اپنی ایک تاریخ ہے اور وہ صدیوں سے اس کام میں مصروف ہے۔ بر سہا برس کی تعلیم و تربیت سے انہوں نے خود مسلمانوں میں سے علماء و محققین کا ایک ایسا گروہ پیدا کر لیا ہے جو اسلامی تحقیقات کے کام میں باعتبار مقصد و منہاج کے ان کا پیرو ہے، اسی لئے انہی میں سے ہے۔ ان کو الگ محسوب کرنے کی ضرورت نہیں۔ (صفحہ ۳۶)....... اسلامی تحقیقات کے میدان میں ان کی کوششوں کا مقصد تحقیق نہیں تدلیس و تلبیس ہے۔ دشمن آپ کے کسی کام میں دلچسپی لے تو سمجھ لیجئے کہ دال میں کالا ہے۔ بے خودی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ مسلمانوں کے علوم و فنون اور اسلامی تعلیمات میں اغیار کی دلچسپی بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے یہ کوئی سربستہ راز نہیں جس سے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہو۔ (صفحہ ۳۷)

آگے چل کر ماہنامہ کے ایک اور فاضل مضمون نگار ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب مستشرقین کی ان ریشہ دوانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا مقصد یہی ہے کہ میں علماء اسلام کی توجہ ان تحقیقات کی طرف دلاؤں جو ان مستشرقین نے علوم اسلامیہ میں کی ہیں تاکہ وہ ان تحقیقات کی تحقیقات کریں اور جو ریشہ دوانیاں ان لوگوں نے کی ہیں ان کا کھوج لگا کر ان کی نشاندہی کریں۔ علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ نہیں جس میں انہوں نے شر انگیزی نہ کی ہو۔ (صفحہ ۴۴)

ادارہ اور مستشرقین

قاری ابھی پوری طرح ادارہ کے اس عمدہ اصول کی داد نہیں دے چکتا کہ اس کی نظریں اسی شمارے کے ان مقامات پہ جا پڑتی ہیں کہ جہاں جگہ جگہ ادارہ نے انہی مستشرقین کے دامن میں پناہ لینے میں فخر محسوس کیا ہے — بلکہ بعض اقتباسات سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ادارہ سرے سے انہی مستشرقین کا قائم کردہ ہے۔ مثلاً ایک مستشرق پروفیسر نکولس ریشر کی ایک انگریزی کتاب (ALEXENDER AGAINST GALON ON MOTION) کو شائع کرنے پر ادارہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس پر ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ (صفحہ ۵۹)

حالانکہ اس کارنامہ کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ملک بھر میں شاید ایک درجن اہل علم بھی فلسفہ کی اس خشک کتاب کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں۔

اس سے ایک صفحہ پہلے یورپ کے ان بائیس ۲۲ ممتاز مستشرقوں کے نام دیئے گئے ہیں جنہوں نے ادارہ کی اسلامی تحقیقات کی تعریف کی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان تعریف کرنے والوں میں کسی ایک

مسلمان اہلِ علم کا نام بھی نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ادارہ کے بلند پایہ علمی رسالے، اسلامک اسٹڈیز میں صرف انہی مستشرقین یا ان کے خوشہ چینوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ پھر، ادارہ کے زیادہ تر اسکالروں نے انہی مستشرقین یا ان کے شاگردوں کی معرفت ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں جس کی طرف خود اسی شمارے میں جا بجا اشارات ملتے ہیں۔ بلکہ مستشرقین کے ساتھ اس تعاون میں ادارہ کئی قدم آگے نکل گیا اور اس مقصد کے لئے اس نے امریکہ کے مشہور ادارے ایشیا فاؤنڈیشن سے مالی تعاون حاصل کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ حالانکہ اُنہی دنوں اِس ادارے کے بارے میں عالمی پریس میں کچھ ناگفتنی قسم کی تفصیلات شائع ہو رہی تھیں۔ مثلاً ہمارے ملک میں روزنامہ نوائے وقت کی ۱۵ر جون ۱۹۶۷ء کی اشاعت صفحہ ۵ پر یہ دو کالمی سرخی شائع ہوئی تھی:-

ایشیا فاؤنڈیشن سی۔ آئی۔ اے (C.I.A) سے امداد لینے والے اداروں سے
<u>چندہ لیتا رہا ہے۔</u>

اور اس کے نیچے یہ خبر درج تھی:-

زیورچ۔ امریکہ کے مشہور خیر ادارہ ایشیا فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو ایسے اداروں اور اوقاف کی طرف سے چندہ ملتا رہا ہے جس پر امریکہ کے بدنام زمانہ جاسوس ادارہ سی۔ آئی۔ اے، سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر مالی امداد وصول کرنے کا الزام ہے۔ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے ماہانہ بلیٹن میں بتایا گیا ہے کہ فاؤنڈیشن نے ان اداروں سے حاصل کردہ رقم دیگر تعلیمی و ثقافتی تنظیموں کو گرانٹ کی صورت میں مہیا کی۔

لیکن اس کے باوجود اس ادارے کے مالی تعاون سے ادارہ کی لائبریری کے لئے کتابیں فراہم کی گئیں، ایک اعلیٰ پایہ کا جدید پریس حاصل کیا گیا، کتابیں حاصل کرنے کے لئے دوسرے ممالک کے دورے کئے گئے اور مستشرقین کی اعانت سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی گئیں۔ اور چونکہ ادارے والے اس مشکوکیت سے قدرے آگاہ تھے اس لئے وہ ایشیا فاؤنڈیشن کی مالی امداد کا ذکر بالعموم اشاروں کنایوں میں کرتے رہے ہیں۔ تاہم شمارہ زیرِ تبصرہ میں بھی صفحہ ۶۰ پر جدید پریس کی تنصیب اور صفحہ ۱۲۹ پر لائبریری کے لئے غیر ملکی کتابوں کی فراہمی وغیرہ کے لئے ایشیا فاؤنڈیشن کی مالی امداد کو کھلے بندوں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ اشاروں کنایوں والی بات کچھ جچتی نہیں، کیونکہ جب یہ ادارہ اپنے پچھلے سالوں کی کارکردگی قوم کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ تو اس کا یہ اخلاقی اور مذہبی فرض تھا کہ وہ قوم کو یہ بھی بتاتا کہ قومی خزانے سے کروڑوں روپے وصول کرنے کے علاوہ اس نے ایشیا فاؤنڈیشن اور اس جیسے دوسرے اداروں سے کتنی امداد حاصل کی۔؟

ایشیا فاؤنڈیشن کا اسکالر

ایشیا فاؤنڈیشن کی اس مالی امداد کی تفصیلات سامنے آتے ہی راقم کو ادارہ کی وہ اچھی بات آگئی جس میں یہ فرمایا گیا تھا کہ دشمن آپ کے کسی کام میں دلچسپی لے تو اس کا مطلب واضح ہے، سمجھ لیجئے کہ دال میں کالا ہے۔ بے خودی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ (صفحہ ۴۷)

مستشرق حضرات تو بڑے لطیف اور خفیہ طریقوں سے اسلام دشمنی کے بارے میں اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ایشیا فاؤنڈیشن نے اس احتیاط کی ضرورت نہ سمجھی، اور اپنا ایک مستشرق ڈاکٹر وڈلیف خالد اسلامی تحقیقات کے لئے ادارے میں بھیجا جو تقریباً نو سال تک ادارے میں "دادِ تحقیق" دیتا رہا اور آخر اس کی بعض سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت پاکستان نے اسے فوری طور پر واپس بھیج دیا۔ ادارہ کو چاہیئے تھا کہ وہ قوم کے سامنے ایشیا فاؤنڈیشن کے اس اسکالر کی اسلامی تحقیقات کو بھی پیش کرتا، لیکن جہاں شمارہ زیر تبصرہ میں ادارے کے قدیم اور جدید تمام اراکین کے نام گنائے گئے ہیں وہاں اسکالر مذکور کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ ہم اس سلسلہ میں اسکے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"!

ادارہ کے قیام کا مقصد

یہ تو تھا ادارہ کا وہ عمدہ اصول کہ جس کی مخالفت پر وہ خود فخر کا اظہار کر رہا ہے۔ اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں کہ اس ادارہ کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ ملک کے اہل علم حضرات کو اس بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ تھا کہ یہ ادارہ قرارداد مقاصد کی اس دفعہ ۳ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا جس میں یہ قرار پایا تھا کہ قرآن و سنت میں جن اسلامی تعلیمات و مقتضیات کا بیان ہے مسلمانوں کو ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے۔ ملک میں مختلف مرتب ہونے والے دساتیر میں اس بارے میں واضح اعلان ہوتا رہا ہے اور ادارہ کے اس شمارے میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے (صفحہ ۶۷) لیکن اپنے قیام کے طویل عرصہ میں اس نے اس سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دیں ہیں، اس کا کوئی واضح تذکرہ اس شمارہ میں نہیں ملتا۔ اس نے اس موضوع کو گول مول انداز میں پیش کیا ہے اور اس تاویل میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی ذمہ داری کی تعبیر ملک کے سیاسی حالات اور برسر اقتدار سیاسی پارٹیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق بدلتی رہی (صفحہ ۷۳) ادارے نے اس سارے عرصے میں جو تحقیقی کارنامے سرانجام دیئے اس کے بارے میں اس کے انچارج وزیر محترم کوثر نیازی صاحب نے خود اسی شمارے میں یہ کہا ہے کہ:-

> چونکہ ادارے میں تحقیق کی سمت کا فقدان تھا اس لئے اس کی
> تحقیقات کا معاشرے پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکا۔
>
> (صفحہ ۹)

اصل ذمہ داری سے پہلو تہی

خیر یہ تو ۱۹۷۳ء سے پہلے کی باتیں تھیں۔ ۱۹۷۳ء کے نئے دستور میں ادارہ تحقیقات اسلامی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ادارہ نے اپنی قرارداد مقاصد والی ذمہ داری سے بھی گلوخلاصی حاصل کر لی اور اب یہ تصور دیا جانے لگا کہ یہ خالص تحقیقی ادارہ ہوگا جس کا کام پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات اور اسلامی تحقیق کے دوسرے اداروں کے کام کو ہم آہنگ کرنا ہوگا (صفحہ ۸۲) اس کے بعد اس کے انچارج وزیر محترم نے اس ادارے کے لئے یہ تین ہدف مقرر کئے کہ وہ عالم انسانی اور عالم اسلامی کو درپیش مسائل پر تحقیق کرے کہ اسلام ان کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ (صفحہ ۸۳) اور ایسا لٹریچر تیار کرے جس میں اسلام کو نوجوانوں کے قابل قبول بنا کر پیش کیا جائے۔ (صفحہ ۸۴) تاہم ادارہ کے بعض اراکین کے تاثرات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں ابھی تک اپنے وزیر کے مقررہ کردہ ان اہداف پر کامل اطمینان نہیں۔ اسی ضمن میں ایک تاثر ملاحظہ ہو:۔

> اب رہا یہ سوال کہ اسلامی تحقیقات کا کیا مقصد ہونا چاہیئے۔ اس سوال کے جواب میں جہاں تک اہداف کے تعین کا تعلق ہے سردست میں اس سے تعرض نہیں کروں گا۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور تفصیلی توجہ چاہتی ہے۔ (صفحہ ۳۹)

سپر یونیورسٹی کا درجہ

ان اہداف پر انہیں اطمینان ہو یا نہ ہو۔ ادارہ والوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ اب چونکہ اس کی حیثیت بدل چکی ہے اس لئے اسے ایک سپر یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اصل الفاظ یوں ہیں:۔

> ابھی تک ادارہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ہمارے ہاں شعبہ تحقیق میں کام کرنے والے ارکان کے عہدے یونیورسٹی کے تدریسی عہدوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت اور تحقیقی تجربہ بھی اسی درجہ کا ہوتا ہے ــــ بلکہ بعض صورتوں میں ادارے کے اسکالرز یونیورسٹی کے اساتذہ سے بہتر اور برتر صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ادارے کو یونیورسٹی کے درجے سے ترقی دے کر سپر یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ تاکہ یونیورسٹیوں کے لئے ادارہ ایک اختصاصی مرکز کی حیثیت سے کام کرے۔ (صفحہ ۴)

ادارہ کے انچارج وزیر محترم کوثر نیازی صاحب نے ادارہ کو اس کے پچھلے پندرہ بیس سال کی کارکردگی پر جو سندِ فضیلت عطا کی ہے (صفحہ ۹)۔ اس کی روشنی میں اس ادارے کو ضرور سپر یونیورسٹی کا درجہ دے دینا چاہیئے۔ !

نئے اہداف اور پرانے اہداف

ادارے کے لئے جو نئے اہداف مقرر کئے گئے ہیں حقیقت میں وہ کوئی نئے نہیں بلکہ اس کے ایک پرانے ہدف کو

نئے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ مثلاً ادارے کے ۱۹۶۰ء کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے ادارے کے اس ہدف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

> اس ادارے کا کام دار الافتاء کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینا نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت محض ایک مشاورتی ادارہ کی ہوگی جو ان مسائل پر جن سے آج مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص دوچار ہیں، اسلامی تعلیمات اور فقہاء و علماءِ سلف کے فتاویٰ کی روشنی میں اپنی سوچی سمجھی ہوئی رائے کا اظہار کرے گا۔ (صفحہ ۵۷)

یہ علیحدہ بات ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ادارہ نے کسی ایسے مسئلے کے بارے میں اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ اس دوران میں اُمّتِ مسلمہ کو بعض ایسے مسائل بھی پیش آئے جن سے کروڑوں مسلمانوں کی زندگیاں پریشان ہو گئیں۔ مثلاً سود کی حرمت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ شریعتِ اسلامی خاندانی منصوبہ بندی کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ اسلامی سوشلزم کیا بلا ہے۔ اسلام کا سیاسی اور معاشی نظام کیا ہے۔ مسلمانانِ عالم میں حقیقی اتحاد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے فرقے کس طرح مٹ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس نے ان مسائل کے متعلق تحقیقات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور بے معنی اور بے مقصد کتابوں کے شائع کرنے ہی کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھ رکھا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت اگست ۱۹۷۴ء میں ایسے مسائل کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی تھی جن پر تحقیقات کی فوری ضرورت تھی۔ کیا ہم اس ادارہ سے اتنا دریافت کر سکتے ہیں کہ ان مسائل کی اہمیت کے متعلق اس کا کیا خیال ہے۔ اور اگر وہ واقعی ایسے ہیں جن پر تحقیق ضروری ہے تو انہوں نے اس ضمن میں کیا کیا ہے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں! اصل مقصد سے ہٹ کر تاسیسی جشن منانے اور اس قسم کے خاص نمبر شائع کرنے میں ہزاروں روپے صرف کر دینا پروپیگنڈہ کا کام تو دے سکتا ہے، اُمّت بیچاری کا کچھ نہیں سنوار سکتا۔

یاد رکھئے! جو کچھ آپ قوم سے لے رہے ہیں، اس کا آپ کو حساب دینا ہوگا ــــ اگلی دنیا میں تو یقیناً، اور شاید اسی دنیا میں بھی۔ یہ حساب، جشن منانے اور نمبر نکالنے سے نہیں چکایا جا سکے گا۔

نوٹ:-

(۱) خط وکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط یا ڈاک ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

بزمِ مذاکرہ

(طلوعِ اسلام کنونشن۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

(قسط سوم)

بزمِ مذاکرہ کی تقاریر کی قسط دوم، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ تیسری قسط اب پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، بزمِ مذاکرہ بالعموم طلبا اور طالبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ شرکاء کا تعارف قسط اول میں کرایا جا چکا ہے۔

۱۱۔ شوکت پرویز

صدرِ گرامی قدر و برادرانِ عزیز!

مذاکرہ میں میرا موضوع ہے۔ "عملِ پیہم"

مجھے کئی روز سے بخار آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے خون کے ٹسٹ کے بعد بخار کی نوعیت متعین کی اور اس کے مطابق دوائی تجویز کی۔ ہدایت کی کہ ہر چار گھنٹے کے بعد ایک کیپسول کھایا جائے گا اور یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک دن رات جاری رکھا جائے گا۔ ایک خوراک کا بھی ناغہ نہیں کیا جائے گا۔ ہدایت پر عمل کیا۔ بخار کم ہونا شروع ہو گیا۔ چوتھی شب آنکھ لگ گئی اور ایک خوراک کا ناغہ ہو گیا۔ اگلی خوراک بروقت کھا لی۔ میں نے سمجھا کہ کوئی بات نہیں۔ اتنے سے وقفہ سے کیا ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ درجۂ حرارت پھر پہلے جتنا بڑھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم نے بہت زیادتی کی ہے۔ جتنی دوائی کھائی جا چکی ہے وہ سب ضائع گئی۔ اب نئے سرے سے ہفتہ بھر کا کورس شروع ہوگا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ دوائی اُن جراثیم کو تلف کرنے والی ہے جو بخار کا باعث ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک خوراک سے جو جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں اُن کے انڈے باقی رہ جاتے ہیں۔ چار گھنٹوں میں اِن سے نئے جوڑے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر نئی خوراک سے وہی ہلاکت عمل میں آ جاتی ہے۔ اگر یہ عمل مسلسل جاری رہے تو تمام جراثیم بتدریج ختم ہو جاتے ہیں۔ اور بیمار کو شفا ہو جاتی ہے۔ اگر درمیان میں وقفہ پڑ جائے تو پہلا کیا کرایا ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اس عمل کو از سرِ نو جاری کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ عمل متواتر کا یہ سلسلہ بیماری تک ہی محدود نہیں۔ انسان کی موت و

حیات کا دار و مدار بھی یہی ہے۔ ہر انسانی جسم کے لاکھوں، کروڑوں جرثومے تلف ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جرثومے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اگر ان نئے جرثوموں کی تخلیق میں کمی واقع ہو جائے تو اس سے بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں اور اگر اس کا سلسلہ ختم ہو جائے تو انسان پر موت واقع ہو جاتی ہے۔ زندگی اس عمل پیہم سے عبارت ہے۔ موت اس کے انقطاع کا نام ہے

میں نے جب اس اصول پر غور کیا تو نظر آیا کہ انسان ہی نہیں، ساری کائنات اس عمل پیہم سے نظام کی رہین کرم ہے۔ علمائے طبقات الارض ہمیں بتاتے ہیں کہ ابتداء میں یہ کرۂ ارض ایک آتشیں ہیولیٰ تھا۔ پھر اس کی حرارت میں بتدریج کمی واقع ہونی شروع ہو گئی اور اس طرح پگھلی ہوئی آگ نے سخت چٹانوں کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ اگر اس میں انقطاع واقع ہو جاتا تو نہ یہ زمین ہوتی نہ اس میں بسنے والی مخلوق۔

اور اس کے ساتھ ہی آپ زمین سے، اس میں بسنے والی مخلوق کی طرف آ جائیے۔ علمائے حیاتیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا ایک جرثومہ (LIFE CELL) سے ہوئی۔ اس سے ارتقا (EVOLUTION) کا عمل جاری ہوا۔ ارتقا کے معنی ہیں مسلسل آگے بڑھنے اور بلند ہونے کے۔ اس تسلسل کے نتیجہ میں زندگی مختلف پیکر بدلتی، مختلف مراحل طے کرتی، مختلف وادیوں میں سے گذرتی، حیوانات کی شکل میں نمودار ہوئی اور ایک قدم آگے بڑھ کر انسانی صورت میں جلوہ پذیر ہو گئی۔ ان مراحل میں جس نوع (SPECIES) نے عمل پیہم چھوڑ دیا، وہ یا تو فنا ہو گئی اور یا وہیں منجمد ہو کر ویسے کی ویسے رہ گئی۔ یہ جو ہمیں انسان سے پیچھے زندگی کے مختلف پیکر نظر آتے ہیں، یا جن کے ڈھانچے زمین سے برآمد ہوتے ہیں یہ سب عمل پیہم میں انقطاع ہونے کے حسرت انگیز اور عبرت آموز مظاہر ہیں۔

اب آئیے انسان اور حیوان کی طرف۔ دونوں کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ایک جیسی ہوتی ہے، لیکن موت کے ساتھ حیوانات کی زندگی کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ فنا ہو جاتے ہیں اور انسانی زندگی کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اسے حیات آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آخرت میں جن خوش بختوں کا عمل پیہم جاری رہتا ہے انہیں اہل جنت کہا جاتا ہے۔ جن کا یہ عمل رُک جاتا ہے انہیں اصحاب جہنم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جہنم کو جحیم کہا جاتا ہے اور جحیم کے معنی ہی رُک جانے کے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا، عزیزان گرامی قدر! کہ یہ ساری کی ساری کائنات کس طرح عمل پیہم کا مظہر ہے۔ اور یہ عمل خود خالق کائنات سے ازل بھی جاری و ساری ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کی ابتدا کرتا ہے۔ اور پھر اس شے کو گردش دے کر آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یہ مراحل ایک ایک یوم میں طے ہوتے ہیں جو ہمارے حساب شمار سے ایک ایک ہزار یا پچاس پچاس ہزار سال کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا اپنے تخلیقی کارناموں میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ خدا کے متعلق جو قرآن نے کہا ہے کہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ، تو اس کے معنی بھی یہ ہیں

کہ اس کے عملِ پیہم میں نہ سستی واقع ہوتی ہے نہ انقطاع۔

جن افراد یا اقوام میں خدا کی یہ صفت منعکس ہوتی ہے انہی کا شمار زندہ انسانوں، اور آگے بڑھنے والی قوموں میں ہوتا ہے۔ قرآن اسی پیغامِ حیات بخش کو لے کر آیا تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ زندگی ایک جوئے رواں کا نام ہے۔ ندی جب تک بہتی رہے ندی ہے، جب وہ روانی سے رک جائے تو جوہڑ بن جاتی ہے جس میں چند دنوں کے بعد سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید نے جہاد کو بلند ترین عمل قرار دیا ہے۔ اور جہاد، جہدِ مسلسل ہی کا دوسرا نام ہے بشرطیکہ اس کی سمت صحیح ہو۔ اس نے جو کہا کہ تم مرتے دم تک مسلم رہو تو اس سے بھی یہی مراد ہے کہ تمہاری ساری زندگی صحیح سمت کے ساتھ جہدِ مسلسل میں گزرنی چاہیئے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ بیٹھے رہنے والے اور چلنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ صحیح سمت میں جہدِ مسلسل کا نام دین ہے، لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی حرکت مبدّل بہ جمود ہو جاتی ہے اور اس کے پیرو مصری عجائب خانوں میں ممی شدہ لاشیں۔ ان لاشوں کے خط و خال، چہرے مہرے، بعینہٖ ویسے کے ویسے ہوتے ہیں۔ ان میں صرف حرکت نہیں ہوتی یہی کیفیت اس دین کی ہوتی ہے جو مذہب میں تبدیل ہو جائے۔ اس میں اگر حرکت ہوتی ہے تو صرف جسمانی اعضا کی۔ روح مصلوب ہوتی ہے نہ فکر منجمد۔ اس میں عملِ پیہم، کولہو کے بیل کا چکر ہوتا ہے جو عمر بھر چلتے رہنے سے بھی وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ دین میں یہ حرکت صراطِ مستقیم پہ سفر کی ہوتی ہے جس میں ہر قدم جانبِ منزل رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ ہے مطلب صحیح سمت متعین کرنے اور عملِ پیہم کا۔۔۔۔۔۔۔

اور عملِ پیہم ہی سے ایک اور اہم نکتہ میرے سامنے آیا۔ ہمیں آج کل بتایا، سکھایا، پڑھایا جاتا ہے کہ انقلاب رونما ہوتا ہے ہنگامہ خیزیوں اور فساد انگیزیوں سے۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جو انقلاب کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے۔ انقلاب اس عملِ پیہم کا متقاضی ہے جس سے قلب و دماغ میں تغیر واقع ہو جائے۔ لہٰذا جمود و تعطل اگر فالج ہے تو ہنگامی عمل سرسام ہے ۔۔۔ جنون ہے۔ زندگی عملِ پیہم سے ترتیب پاتی ہے اور اسی کا فقدان ہماری تباہی کا بنیادی سبب ہے۔۔۔۔۔۔!

یوں تو ہمارے آج کے مذاکرہ کا موضوع، اقبالؒ کا ایک شعر ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو یہ ایک شعر، اقبالؒ کے سارے پیغام کا ترجمان، دین کی اساس اور اس حقیقت کا مظہر ہے کہ زندگی عبارت ہے عملِ پیہم سے۔ اور موت نام ہے اس میں انقطاع کا۔ کس قدر مبنی بر صداقت ہے یہ مشاہدہ کہ:

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔

والسلام

۱۲- تجبیر فاروقی

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

محترم باباجی اور سامعین کرام!

اِس دفعہ پھر اپنی حسین ترین روایت کو قائم رکھتے ہوئے طلوعِ اسلام کنونشن کی بزمِ مذاکرہ ایک آن بان کے ساتھ نئی نشانِ فکر کی برق تجلی لئے ہوئے مرحلۂ شوق میں داخل ہو چکی ہے۔ اور کسی مفکرِ اعظم نے علم کی طشتری میں چند جواہر حیات ہمارے سامنے لاکر رکھ دیئے ہیں تاکہ ان سے رواں نور کی ندی سے چشمِ بصیرت کی چمک بڑھ جائے۔ جہاں تک میری قوتِ متخیلہ پرواز کرتی ہے، ان کے مطابق یہ جواہر یعنی

یقین محکم، عملِ پیہم، محبت فاتح عالم

ایک عالمگیر تہذیب کی عمارت کے وہ بنیادی ستون ہیں جن پر تہذیب کی عمارت نہ صرف محکمیت سے قائم ہے بلکہ اپنے گہرے وسیع سینے میں بے حد و حساب اور وقت اور فضا کی قید سے آزاد قوتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے فلک الافلاک کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ خصوصیات اور یہ محکم اصول اگر ہم ایک محسوس پیکر میں لے آئیں تو یہ ہمارے نقطۂ ایمان کی وہ عملی تفسیریں ہوں گی جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہو جاتی ہیں۔

معزز سامعین! مطالعۂ تاریخ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر تہذیبی دور ایک ٹوٹ پھوٹ کا سامنا کرتا رہا۔ وہ ٹکراؤ کی صورت حال میں رہا۔ ان کے معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی نظام کا حضرت نوحؑ کی مخالف پارٹی کے سیلاب میں تیرتے ہوئے گھڑوں کی طرح ٹکراؤ ہوتا رہا، اور ان سب کا خصوصی ٹکراؤ ان کے الگ، جداگانہ اور نہایت پرائیویٹ مسئلہ مذہب کے ساتھ رہا۔ بناؤ سنوار اور توڑ پھوڑ کے اس مرکب کی تہاذیب یعنی مصر، یونان، چین و ترکستان ہی نہیں، بلکہ سپین و ہندوستان۔ اور ان سے بھی آگے بڑھئے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ؎

آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

اور ان ہی تہاذیب کے کھنڈرات بالاشبہ یہ رپورٹ دے رہے ہیں کہ انہیں رواں دواں زندگی میں کبھی استحکام نصیب نہیں ہوا۔ لیکن تہذیب کی اسی ندی کا دوسرا کنارا، اگر ہم اسے اسلام کا نام دے دیں، تو یہ ہمیں کہیں زیادہ سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ اس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے اسلام کے یہی محکم اور نفع بخش اصول ہیں اور جن میں ایمان محکم کو عالمہ اقبالؒ بنیادی قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ شے ہے جو قوتِ پرواز کی محرک بنتی ہے۔ ورنہ عالمِ بے یقینی میں انسان خشک پتوں کی طرح ادھر

اُدھر اُڑتا پھرتا ہے۔

معزز سامعین! اپنے اصولوں پر، اور اصولوں کے پھلدار نتائج پر کامل یقین و بھروسہ تھا کہ محمدؐ عربی بلا خوف و خطر پکار اُٹھے تھے کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تب بھی میں اپنی بات کہنے سے باز نہ آؤں گا۔ یقینِ محکم کی دوسری مثال جو ہمیں ملتی ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں یا اپنی ذات پر اپنے مقاصد و اعمال کی جانفزا صداقت پر جو مرگ و زیست کی ہر کشمکش کے لئے اکسیر اعظم ہے۔ ہر کامرانی کی کلید ہے اور ہر کامیابی کی تمہید ہے۔ وہ سعی و عمل کی بے مثال پری، قراۃ العین طاہرہ میں بادشاہِ وقت کے منہ پر جرأت و بے باکی سے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری
اگر ایں خوش است تو درخوری وگر آں بدست مرا سزا

سامعینِ کرام! ایمانِ کامل کے ساتھ ساتھ مسلسل عمل کا اکتساب لازمی امر ہے۔ جس قوم کے افراد میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں اسی کی حیات و سلامتی کا ذمہ قانونِ فطرت نے لیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے اکثر علماء دین اس بات پر جھگڑا کرتے رہتے ہیں کہ عمل کی ماہیت کیا ہے۔ ان کے نزدیک منکے پھیرنا اور مُنہ میں گنگنانا ہی عمل ہے۔ سیروا فی الارض کے الفاظ کو محض تسبیح تک دوڑانا ہی عمل ہے، لیکن یہ تو سب بے نتیجہ حرکات ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم قرآنِ کریم کی بات کریں تو اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ اگر یہ سراپا علم ہے تو سراپا عمل بھی ہے۔ یہ جڑ سے پھول تک ایک عمل ہے اور علامہ مشرقی کے الفاظ میں "اس کی توحید عمل ہے۔ اس کا ایمان عمل ہے۔ اس کا اتقا عمل ہے، اس کی عبادت عمل ہے۔ اس کا صراطِ مستقیم عمل ہے۔ متحدہ و متفقہ عمل ہے، طاقت اور زور کا عمل ہے۔۔ تعویذوں، تسبیحوں اور گوشوں کا عمل ہرگز نہیں ہے ـــ اور یہ وہ فضا ہے جہاں مُلّا اور مجاہد مخالف سمتوں میں پرواز کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف صوفی گوشہ سنبھالے ہوئے مذہب کی افیون کھائے ہوئے خود پیدا کردہ کیف و مستی میں گم ہے تو دوسری طرف ایک مردِ مجاہد قرآنی اقدار کے کھیت کو لہلہاتا دیکھنے کے لئے سعیِ پیہم میں مصروف ہے، جو نہ ماضی پر قناعت کئے بیٹھا ہے۔ نہ زمانہ حال میں بے کار ہے اور نہ مستقبل کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ تو وہ ہے کہ بقول

جس کی صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ ہمیں ایک بہت بڑے صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے الفاظ سناتے ہیں انہوں نے ایک دفعہ فرمایا کہ:-

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

انہوں نے تو اپنے مخصوص موڈ میں یہ کہنا تھا سو کہہ دیا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الفاظ ایک صوفی کی

ومہ داری اور ایک نبی کی ذمہ داری نمایاں طور پر فرق کر رہے ہیں۔ یہ زمین سے چپکا ہوا صوفی اگر عالمِ انسانی میں جاننا چھوڑتا نظر بھی آئے تو اس کا وجود بنی نوعِ انسان کے لئے بے معنی ہے اور گوشۂ قفس کے اندر آرام بہت سہے۔ لیکن ایک نبی اور اس کے پیروؤں کے لئے اس کی صلوٰۃ زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے عمل کی لوح کشمکشِ انقلاب ہے۔ اس کی تہذیب و تمدن ایک بامقصد اور عالم انگیز حرکت ہے مگر اس کے برعکس صوفیائے کرام نے قوم کی قوتِ عمل کو ضعیف کرنے کے لئے مختلف نظریات کی ساخت کی۔ ان میں فوقیت وحدت الوجودی نظریئے کو ہے جس کے مطابق اس کائنات کی ہر شے خدا کی ذات کی مظہر ہے۔ اس نتیجہ کے طور پر افراد کی قوت محض نظریاتی مباحث اور مناظرہ بازی میں صرف ہونے لگی۔ ہمارے مفکرِ اعظم علامہ اقبالؒ کہ جو قوم کو پیہم جدو جہد اور راہِ زیست میں دم بھر کے ٹھہرنے کو شکست و ریخت سے تعبیر کرتے ہیں، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی صوفیا کی ذہنی ہولی اس افیون میں گم تھے۔ اس سلسلے میں وہ اقبالؒ کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ۔

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا!

اور مزید یہ کہ ۔

دیکھ تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے!
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

اس کے علاوہ یہ کہ ۔

کھول کر ذوقِ دید لے آنکھیں تیری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ!

جبکہ اس سلسلے میں اقبالؒ اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ :۔

مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریعت پر غور و فکر کرنے کے بعد غیر اسلامی ثابت ہوئے۔

معزز سامعین! تصوف کا زور اوّل اوّل ایران میں رہا۔ چونکہ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع تھے اور رفتہ رفتہ تمام عجمی شعراء اسی رنگ میں رنگین ہو گئے اور ان کی سحر آگیں نکات آفرینیوں کا آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

اقبالؒ پھر فرماتے ہیں کہ :۔

دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے عملی ارتقاء کے لئے تصادم ضروری ہے۔ انسان کو زیادہ استحکام و استقلال سے حاصل ہوتا ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر میں جمود و سکون

اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود
ہو، مردود قرار دیتا ہوں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ تمدنی تحریک کی حیثیت سے اسلام کا نشانہ کسے سائنٹ نظریئے کو متحرک کرنا ہے، اور متحرک نظریئے تک پہنچنا ہے ——— لیکن اگر ہم دیکھیں کہ اسلام میں کس انداز کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو یہ عیاں ہوگا کہ اپنے اندر ایک جاذبانہ کشش کے ساتھ، ایک خاص انداز نظر کے ساتھ۔ باہمی پیار، التفات کے ساتھ، مواخات و بھائی چارے کے حسین اصول کے ساتھ، خود غرضی اور ذاتی مفاد کے بتوں کو توڑتے ہوئے ایثار و قربانی، وسیع القلبی اور باہمی محبت کی مشترک لہروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ قافلہ اسلامی سطح ارض پر جہاں جہاں سے گذرا ہے انہی خصوصیات کے انمٹ نقوش چھوڑتا گیا ہے اور یہ ذی روحوں کو محبت کی مقناطیسی کشش سے اپنا گرویدہ بناتا گیا ہے اور تاریخ بھی اس حقیقت کی گواہ ہے کہ انہی خصوصیات کی بناء پر وہ عرب قوم جو ایک ذرا سی آنچ تھی ایک مشعلِ بیکراں بن کر بڑی بڑی قوتوں کو بہا لے گئی۔ یہ ان صاحب کمال لوگوں کا کردار تھا جس سے متاثر ہو کر روم و ایران، شام و فلسطین، مصر، شمال افریقہ اور فارس کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ انہیں تلوار کے وار کا خوف نہ تھا، بلکہ ان کے قلوب ان مومنین کے حسن سلوک سے دھڑک اٹھے تھے۔ اور پھر اس کے بعد ان کلوب پر افریقہ، چین اور مشرقی ہندوستان کے جزائر اسلام سے سرفراز ہوئے۔ وہ اگر تلوار کے وار کھاتے تو کٹ کٹ کر مر جاتے مگر انہوں نے محبت بھری نظریں دیکھیں جس سے ان میں نئی تازگی پیدا ہوئی ——— اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر اس جذبہ کو مٹا دیا جائے تو آدمی اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز شاعر (T.S. ELIOT) نے بیسویں صدی پر تنقید کرتے ہوئے موجودہ زمانے کے انسان کی یہی خصوصیت بتائی ہے۔ وہ اسے (THE HOLLOW HUMAN) کہہ کر پکارتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایک کھوکھلا آدمی کس مقصد حیات کا تعین کر سکتا ہے جس کے لئے وہ خود کو مصروف عمل رکھے گا؟ ہمیں ان اصولوں کی دنیا میں آنا پڑے گا کہ یہی وہ مشرق ہے جہاں حیاتِ ایمانی کا سورج ہمیشہ طلوع ہوتا رہے گا۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ایمان کے مرجھول کے دلوں میں محبت کی نہر مسلسل نہ لوٹتی رہے۔ جب تک مساوات و اخوت کا آسمان مشکن دور اخوت کے ہر گوشہ میں جاری و ساری رہے ——— شکریہ

۱۳۔ ننھی بچی ——— رانی [illegible]

میرے معزز ہم مکتبو! آپ کی بچی سلام عرض کرتی ہے۔

انسان کی زندگی کا دار و مدار سانس لینے پر ہے۔ لیکن انسان صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے، جب تک سانس لینے کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ جونہی یہ سلسلہ رکا ——— انسان پر موت

طاری ہو گئی۔ لہٰذا زندگی نام ہے عملِ پیہم کا۔

۱۴۔ رانی کا بھائی — گوگی (دو فقروں کی تقریر)

میرے بزرگو! السلام علیکم۔
میری بہن نے عملِ پیہم کی مثال سانس کی آمد و رفت سے دی ہے۔ مثال اچھی ہے۔ لیکن میں ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ زندگی عبارت ہے دل کی دھڑکن سے اور حرکتِ قلب بند ہو جانے کا نام موت ہے۔ لہٰذا سلسلۂ حیات، عملِ پیہم کی مختلف کڑیوں سے ترتیب پاتا ہے۔ اگر اس کی ایک کڑی بھی گم ہو جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شکریہ

۱۵۔ نجمہ صفدر

میرے بزرگو! بہنوں اور بھائیو۔ سلام مسنون
بابا جی نے پوچھا کہ بیٹی! ..... اب تم دور چلی گئی ہو۔ کیا کنونیشن پر آنے کا ارادہ ہے: میں نے کہا بابا جان! اگر جرأت عرض معاف ہو تو کہوں کہ مردوں کو چونکہ میکہ چھوڑنا نہیں پڑتا اس لئے انہیں میکے کی کشش و جاذبیت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اسے صرف ہم لڑکیاں ہی جان سکتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ پرندے فضا کی پہنائیوں میں ہزاروں میل تک بھی اڑتے چلے جائیں ان کی نگاہ ہمیشہ شاخِ آشیانہ پر رہتی ہے۔ یہی کیفیت ہم لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ ہم صحنِ رشکِ جنت میں بھی کیوں نہ چلی جائیں ہماری نگاہیں میکے کے در و دیوار پر مرکوز رہتی ہیں۔ ہم کنونیشن کو اپنے میکے کا تیوہار اور بابل کی سالگرہ سمجھتی ہیں۔ اور بابل بھی وہ جس نے ہمیں جہیز میں وہ متاعِ حیات عطا کی، جو ساری کائنات سے زیادہ گراں بہا ہے۔ تو پھر میں کنونیشن میں کیوں نہیں آؤں گی؟ سو میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ اِس جشن میں شریک ہوں۔
بابا جی نے کہا ہے کہ اس دفعہ مذاکرہ کے موضوع میں بڑی وسعت ہے۔ ایک چھوڑ تین تین عنوانات ہیں۔ یقینِ محکم۔ عملِ پیہم۔ محبت فاتحِ عالم۔ ان میں سے جسے پسند کرو اس کا انتخاب کر لو۔ اوروں کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرے لئے انتخاب کا مسئلہ بجائے خویش امتحان گاہ بن گیا۔ آپ نے شاید فلاسفر کے بیل کا قصہ سنا ہوگا۔ گھاس کا ایک ڈھیر اس کے دائیں طرف تھا اور اسی جیسا ڈھیر بائیں طرف۔ اور بھوکا بیل جسے حقِ انتخاب دیا گیا تھا؛ ان کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ ایک ڈھیر کے حق میں دلائل دینے کے بعد دوسرے ڈھیر کی طرف دیکھتا تو پہلی دلیلوں کو رد کرتا ہوا اس کے حق میں دلائل دینے لگ جاتا۔ دلائل دونوں طرف کے یکساں وزنی تھے۔ نتیجہ یہ کہ گھاس کے ڈھیر ویسے

کے ویسے رہ گئے اور بیل بھوک سے چل بسا۔ بیل کا قصہ افسانہ سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقِ انتخاب جسے خالقِ فطرت نے اپنا بہت بڑا احسان قرار دیا تھا بیچارے ابنِ آدم کے لئے زندگی کا دشوار ترین مسئلہ بن گیا۔ یہ ساری ذمہ داریاں اسی حقِ انتخاب ہی کی تو پیدا کردہ ہیں۔ بہرحال میرے لئے انتخاب کی یہ وسعت واقعی ایک مسئلہ بن گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کونسے عنوان کو لوں اور کونسا چھوڑ دوں۔ ہار تھک کر میں نے سوچا کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی بات صاف اور واضح ہے۔ ان میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن "محبت فاتح عالم" کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا امکان ہے۔ میں کیوں نہ اسے رفع کرنے کی کوشش کروں؟ سو میں نے اس تیسرے عنوان کو منتخب کر لیا۔

عزیزانِ من! عیسائیت نے دنیا کو یہ تاثر دیا کہ وہ سرتاپا محبت اور رحم کا مذہب ہے۔ اس کے عقیدے کی رو سے (GOD IS LOVE) خدا محبت ہے۔ (GOD IS MERCY) خدا رحم ہے۔ اُس کا حکم یہ ہے کہ (LOVE THY ENEMY) اپنے دشمن سے بھی محبت کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یورپ کی قومیں پروپیگنڈے کے فن میں ماہر ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت .... کا چراغ جل نہیں سکتا تو انہوں نے اسلام کی ایسی بھیانک اور خوفناک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں ——— اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اسلام کا نام آتا ہے "قتل و غارت گری" بربادی اور تباہی ——— ہلاکت اور خونریزی ——— ظلم و ستم کے خونیں مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آ رہے ہیں اور اس سیلاب بلا سے تہذیب و تمدّن - عدل و انصاف، عفت و عصمت، ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کے پروپیگنڈے سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مقابلہ میں اپنے مذہب کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس سے انہوں نے اسلام کو تو ضرور بدنام کر دیا، لیکن ان کے مذہب کی افضلیت اس سے ثابت نہ ہو سکی۔ افضلیت تو ایک طرف۔ جب خود عیسائی مفکرین نے اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو وہ اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ صرف سطحی جذباتیت کی باتیں ہیں جن پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ میں ان میں سے دو ایک مفکروں کی آراء آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ مثلاً مشہور فلاسفر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ:-

> انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اگر اسے موجودہ زمانے میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہو۔

پروفیسر جوڈ اس باب میں کہتا ہے:-

> عیسائیت کی رو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا شر اور فساد کی دنیا ہے۔ اس میں کوئی شے خیر کی نہیں۔

اس کی اس ناکامی کی وجہ کیا ہے اس کے متعلق ہسپانیہ کا پروفیسر (DR. FALTA) لکھتا ہے کہ:-

> عیسائیت میں عدل کا تصوّر بھی اُسی طرح ناپید ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو جو ظلم اور استبداد کے نیچے دبے ہوں، محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم کا سبق سکھایا ہے۔ لیکن ان کے لئے عدل اور انصاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور یہی وہ بنیادی اخلاقی قدریں ہیں جن کے نہ ہونے کی وجہ سے عیسائیت نہ صرف ناکام رہی بلکہ دنیا میں ظلم اور استبداد عام کرنے کا موجب بن گئی۔ انہیں اسلام نے مہیّا کیا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ دشمن سے محبت کرو۔ ایسا کرنا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے برعکس اس نے کہا کہ دشمن سے عدل کرو۔ عدل کرنا ممکن بھی ہے اور دنیا کے لئے امن و سلامتی کی ضمانت بھی۔ جس معاشرہ میں تمام افراد کو یقین ہو کہ ان کے ساتھ ہمیشہ عدل ہوگا ـــ کوئی دھاندلی نہیں ہوگی۔ کسی سے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اور زیادتی کرنے والے دندناتے نہیں پھریں گے۔ اس معاشرہ میں افراد کے دل میں باہمی نفرت، عداوت، بُغض، کینہ، انتقام کے جذبات پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ ان کے بجائے محبت اور ہمدردی کے جذبات اُبھریں گے ـــ اس کے ساتھ ہی اس نے طاقتور لوگوں کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں اور کمزوروں کے پشت پناہ بنیں اور دیکھیں کہ اُن پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ اسلام کی تلوار ظالموں کا ظلم روکنے کے لئے اُٹھتی ہے۔ مظلوموں کا گلا کاٹنے کے لئے نہیں۔ ہمارے رسول کریمؐ نے فرمایا کہ تم ظالم اور مظلوم دونوں سے محبت اور ہمدردی کرو۔ عرض کیا گیا کہ مظلوم سے محبت اور ہمدردی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کے ساتھ محبت اور ہمدردی کس طرح کی جائے گی۔ فرمایا کہ ظالم کو اُس کے ظلم سے روک دینا اس کے ساتھ انتہائی محبت اور ہمدردی ہے۔ اس لئے کہ اِس سے وہ اس تباہی سے بچ جائے گا جو ظلم کی وجہ سے اُس پر وارد ہونی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا تھا کہ میرے نزدیک ہر طاقتور کمزور ہوگا جب تک مَیں اس سے کمزور کا حق نہ لے لوں، اور ہر کمزور طاقتور ہوگا جب تک مَیں اس کا حق نہ دلوا دوں۔

یہ تھا طاقتور اور کمزور دونوں سے محبت اور ہمدردی کا صحیح طریق اور یہی تھی وہ شمشیر جس کے زور سے اسلام پھیلا تھا۔ جب مسلمانوں نے عیسائیوں کی بستی حمص کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کو اس امر کی ضمانت دی کہ اُن کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ اس کے بدلے میں اُن سے یونہی نام نہاد سا ایک ٹیکس لے لیا گیا۔ قریب چھ ماہ کے بعد مسلمانوں کی فوجوں کو کسی دوسری جگہ جانا پڑا تو انہوں نے حمص کے باشندوں سے کہا کہ ہم نے تم سے جو ٹیکس لیا تھا وہ سال بھر تک تمہاری حفاظت کرنے کے بدلے میں تھا۔ چونکہ ہمیں چھ ماہ کے بعد دوسری جگہ جانا پڑ گیا ہے اس لئے ہم تمہاری حفاظت کا فریضہ ادا نہیں کر سکیں گے، یہ لو تمہارے ٹیکس کی آدھی رقم ـــ اسے واپس لے لو ـــ اہلِ حمص رو رہے تھے اور ان کی منّتیں کر رہے تھے کہ ٹیکس ہو یا نہ ہو تم یہاں سے نہ جاؤ۔ ورنہ

وہی بھیڑیئے یہاں پھر آ جائیں گے ——— اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ بھیڑیئے کون تھے؟ انہی کے ہم مذہب عیسائی حاکم۔ یہ تھی وہ شمشیر جس سے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو فتح کیا تھا۔ ان کی زمینوں کو نہیں، اُن کے دلوں کو فتح کیا تھا۔ اِس سے بھی آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم نے بھی خدا کو رحیم کہا ہے۔ لیکن اُس کے رحم اور عیسائیت کے رحم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خدا کی رحمت سے مراد ہے اس کی ربوبیت۔ انسانوں کی پرورش۔ اس انداز کی پرورش جیسے رحمِ مادر میں بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ پرورش بلا مزد و معاوضہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اس پرورش میں ماں کا بچے پر احسان بھی نہیں ہوتا۔ خدا کی طرف سے اس پرورش میں اچھے اور بُرے، نیک اور بد، حتیٰ کہ کافر اور مومن سب شامل ہوتے ہیں۔ خدا کی یہی رحمت تھی، جس کا عملی ثبوت اُس نظام میں ملتا ہے جو اِس رحمت کے عام کرنے والوں نے قائم کیا تھا۔ جب رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ "جس بستی میں رات کو ایک فرد بھی بھوکا سو گیا، اُس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو گئی" تو اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ مسلم اور غیر مسلم تو ایک طرف یہ رحمت تو حیوانوں تک کو بھی اپنے دامن میں لے لیتی تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ:

> اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہو گی۔

تو یہ اُسی رحمتِ خداوندی کا عملی ثبوت تھا۔

لہٰذا عزیزانِ من! یہ تھی محبت کی وہ شمشیر جو یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے حامل انسانوں کے ہاتھ میں تھی اور جس کے زور پر وہ فاتحِ عالم بنے تھے۔ اور یہی مفہوم ہے میرے نزدیک علامہ اقبالؒ کے اس پیغام کا جو ہمارے آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے۔ اِس شمشیر میں آج بھی فاتحِ عالم بننے کا جوہر موجود ہے۔ بشرطیکہ اس پر ایمان کی آب چڑھا دی جائے۔ یہی وہ آب ہے جس سے دلوں کی شمشیروں کے زنگ اترتے اور ذہنوں کی تلواروں کی دھار تیز ہوتی ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اب زنگ آلود تلواریں بھی نہیں رہیں۔ ہمارے پاس خالی نیام ہی نیام ہیں۔ لفظی ایمان، رسمی اسلام، بے ذوق سجدے، بے روح نمازیں۔ اِن سے دنیا کا فتح کرنا تو ایک طرف انسان اپنے آپ کو بھی فتح نہیں کر سکتا۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص اپنے آپ کو فتح نہیں کر سکتا وہ فاتحِ عالم بھی نہیں بن سکتا۔ جب علامہ اقبالؒ مسولینی کو ملنے کے لئے گئے تو اُس نے اِن سے کہا کہ مَیں یہ جانتا ہوں کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے (یعنی ہتھیار) اُس کے پاس سب کچھ ہے۔ آپ نے کہا کہ اس فقرے کو ذرا بدل لو اور یہ لکھو کہ جو شخص خود فولاد ہے وہ سب کچھ ہے۔ یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے انسان وہ فولاد بن جاتا ہے جس کے سامنے کوئی تلوار نہیں ٹھہر سکتی۔

مَیں تو، میرے بزرگو اور عزیزو! اسلام کا مطلب یہی سمجھتی ہوں۔

والسلام

۱۶- سلمیٰ پرویز

یقینِ محکم

میرے واجب الاحترام بزرگو!

اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو۔

مَیں نے اپنے پیشروؤں کی تقاریر کو بڑی توجہ سے سنا ہے، اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے مذاکرہ کا معیار بلند ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہم دونوں بہنوں نے اپنے بچپن میں، گھر کے صحن میں امرود کا ایک پیڑ لگایا تھا اور باہر کنونشن کے مذاکرے کا آغاز کیا تھا۔ یہ امر موجبِ صد مسرت ہے کہ یہ دونوں پودے، بڑھتے، پھولتے، پھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے، اور ان کے باغبان کو قائم و دائم!

ان تقاریر میں مَیں نے اس نکتہ پر خاص توجہ دی جس کا تعلق یقینِ محکم سے ہے، کہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر عمل کی عمارت اُستوار ہوتی اور اُس پر محبت کے نقش و نگار اُبھرتے نکھرتے ہیں۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ:-

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر

تو خونِ جگر سے اُس کی مراد، یقینِ محکم ہی تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر یقینِ محکم، سزاوارِ حمد و ستائش ہوتا ہے یا اس میں کوئی تخصیص کی جانی چاہیئے؟ غالبؔ نے تو یہ کہہ کر اس تخصیص کو ختم کر دیا کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو، کعبہ میں گاڑو برہمن کو!

یعنی اُس کے نزدیک، ہر یقینِ محکم، خواہ وہ کسی بات پر بھی کیوں نہ ہو، قدر و قیمت میں برابر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حقیقت ہے یا محض شاعری۔ یا وہ رواداری جو رام اور رحیم میں کچھ فرق نہیں کرتی۔

مَیں اسی نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں۔

ہندوستان، اور کئی دیگر ممالک میں ایسے قبائل ہیں (بالخصوص بھارت کے شودر) جو اپنے بچوں کو بتوں کے استھان پر ذبح کر دیتے ہیں، اس یقینِ محکم کی بناء پر کہ اس سے دیوتا خوش ہو جاتے ہیں، اور وہاں کے برہمن انہی شودروں کو زندہ جلا دیتے ہیں، اس یقینِ محکم سے کہ برہما ایسا ہی چاہتا ہے۔ وہاں ہر سال پوری کے مقام پر، جگن ناتھ جی کے رتھ کا جلوس نکلتا ہے —— اس رتھ کو یوں سمجھیے جیسے دیو ہیکل روڈ رولر ہو —— اور اُس کے بھگت اپنے آپ کو اُس کے پہیوں کے نیچے لٹا کر انتہائی کرب و اذیت سے جان دے دیتے ہیں، اس یقینِ محکم کی بنا پر کہ اس سے مکتی (نجات) حاصل ہو جاتی ہے۔ وہاں کی عورتیں اپنے خاوند کی چتا میں جل کر راکھ ہو جاتی تھیں، اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ

اس سے وہ اور اُن کا خاوند اگلے جنم میں پھر میاں بیوی بن جائیں گے۔

اُدھر سے ہٹ کر آپ اپنے ہاں آ جائیے۔ کتنی مائیں اپنے بیمار بچوں کو مزاروں، استھانوں، بلکہ وحشت انگیز جنگلوں اور بیابانوں میں لئے لئے پھرتی ہیں، اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ اس سے بچے کو شفا ہو جائے گی، اور کتنی معصوم لڑکیوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر ہلکان کر دیا جاتا ہے، اس یقینِ محکم کی بنا پر کہ اُن پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہے اور ان اذیتوں سے وہ سایہ ٹل جائے گا ــــ اور پھر کتنے دانشورانِ قوم اور راہنمایانِ ملّت ہیں جنہیں آپ مٹی اور پتھر کے ڈھیروں کے سامنے سجدوں میں پڑے آنسو بہاتے دیکھیں گے۔ میں اُن کا ذکر نہیں کر رہی جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے منافقًا طور پر ایسا کرتے ہیں۔ میں ان کا ذکر کر رہی ہوں جو اس یقینِ محکم کے ساتھ ایسا کرتے ہیں کہ اس سے ان کی مرادیں بر آئیں گی ــــ منافعے حاصل ہوں گے۔ مناصب مل جائیں گے۔

آپ اِن مثالوں میں سینکڑوں کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اِس قسم کا یقینِ محکم، جہادِ زندگی میں مردوں کی شمشیریں کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی ایسا کہنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ یہ یقین، جہالت کا پیدا کردہ اور توہّم پرستی پر پرورش پاتا ہے، اور اُن قوموں میں اُبھرتا ہے جو کشمکشِ حیات سے فرار کی راہیں اختیار کر لیتی ہیں، اور ان کی شمشیریں کُند ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ یقین نہیں بلکہ فریبِ نفس ہوتا ہے جسے قرآن ایمان بالباطل کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے مقابلہ ایمان بالحق ہے، جو علم و بصیرت سے پیدا ہوتا اور دلائل و براہین سے مستحکم ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس فرق کو آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں نمایاں کیا تھا جب ساری دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس قسم کے یقین، یعنی خود فریبی، کو بڑا مقدس قرار دیتی تھی۔ قرآنِ کریم کے اس بتائے ہوئے فرق کو آج علم کی بارگاہوں سے تائید حاصل ہو رہی ہے۔ ہمارے دور کے سائیکلوجسٹ، یقین، یعنی (FAITH) کو دو شقوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک (IRRATIONAL FAITH) اور دوسرا (RATIONAL FAITH) اور قرآن اِسی (RATIONAL FAITH) کو یقینِ محکم یا ایمان کہہ کر پکارتا ہے۔

اس کے بعد میں اس سوال کے دوسرے گوشے کی طرف آتی ہوں۔ اور" یہ کہ وہ کونسی بات، کونسی حقیقت ہے جس پر یقینِ محکم مردوں کے ہاتھ میں شمشیر بن جاتا ہے؟

یہ یقینِ محکم ہے، انسان کا خود اپنے آپ پر۔ اپنی ذات پر۔ اپنی قوتوں پر۔ اپنی ممکنات پر۔ اپنی مضمرات پر۔ اسی کو خود اعتمادی کہا جاتا ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ قرآنِ مجید کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے، تو میں دو لفظوں میں کہہ دوں گی کہ قرآن نے انسان کو بتایا کہ کائنات میں اُس کا صحیح مقام کیا ہے؟ اس نے انسان کو خود شناس اور خود آگاہ کیا ــــ وقت نہیں ورنہ میں بتاتی کہ جسے اللہ پر ایمان کہتے ہیں اس کا فطری نتیجہ انسان کا خود اپنی ذات پر ایمان ہے ــــ اِس وقت میں صرف

ایک اشارہ پر اکتفا کروں گی۔ سورۂ حشر میں ہے کہ:-

دیکھنا! تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا۔

تو اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھلا بیٹھے۔ یعنی خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے۔ مشہور سائیکلوجسٹ (ERICH FROMM) نے اسے

(MAN'S INDIFFERENCE TO HIMSELF)

کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ خود فراموشی کا مفہوم سمجھنے کے لئے اِن سے زیادہ موزوں الفاظ شاید ہی مل سکیں۔ انسان کی یہ خودشناسی اور خود آگہی کیا ہے؟ اس حقیقت پر ایمان کہ حالات کتنے ہی بدل جائیں۔ خارجی دنیا میں کیسے ہی تغیرات کیوں نہ رونما ہو جائیں — میں نہیں بدل سکتا۔ مجھ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ میں آج بھی وہی ہوں جو کل تھا — اور کل بھی وہی ہوں گا جو آج ہوں۔ اسی سے انسان کو اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے دوسرے اس پر اعتماد کرتے اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جو شخص آج کچھ ہو، کل کچھ، وہ نہ تو جہادِ زندگی میں کوئی کارِ نمایاں سرانجام دے سکتا ہے، نہ کسی کی نگاہوں میں اس کی عزت ہو سکتی ہے۔ حقیقی انسان وہی ہے جو کہے کہ میں ایسا کروں گا اور ہر شخص کو اس کا اعتماد ہو کہ وہ واقعی ایسا کرے گا۔

انسان کی تعریف یا (DEFINITION) کے متعلق دنیا کے مفکرین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان، حیوانِ ناطق ہے۔ کسی نے کہا کہ انسان وہ حیوان ہے جو اوزار بنانا جانتا ہے۔ کسی نے کہا کہ انسان وہ حیوان ہے جو آگ جلانا اور پکا کر کھانا جانتا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جرمنی کے مشہور فلاسفر نطشے نے انسان کی جو (DEFINITION) پیش کی ہے وہ بڑی موزوں، برجستہ اور قرآنی تصور کے قریب تر ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ:-

(MAN CAN BE DEFINED BY HIS CAPACITY TO PROMISE)

یعنی یہ خصوصیت صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایسا کروں گا — وہ وعدہ کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا وہی کہہ سکتا ہے اور کر سکتا ہے جس کا (SELF) جس کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ ان اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جو غیر متبدل ہیں۔ اسی کو ایمان باللہ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جن کاموں کو اعمالِ صالحہ کہا ہے وہ، وہ ہیں جن سے اس کی ذات میں استحکام پیدا ہو، اور اس کی خود اعتمادی بڑھتی چلی جائے۔ اس کے برعکس اس نے جن نظریات، اعتقادات کو باطل کہہ کر پکارا ہے وہ، وہ ہیں جن سے انسان کی خود اعتمادی میں ضعف پیدا ہو۔ میں یہاں ان کی دو ایک مثالیں پیش کرتی ہوں۔ ان نظریات یا اعتقادات میں سرفہرست جبر، یا (DETERMINISM) کا عقیدہ آتا ہے۔ یعنی تقدیر کا عقیدہ۔ آپ سوچئے کہ جو شخص یہ کہتا اور مانتا ہے کہ میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ہوتا ہے، قسمت یا تقدیر کی رو سے

ہوتا ہے جو پہلے سے لکھی جا چکی ہے اور غیر متبدل ہے، وہ اپنی خود اعتمادی سے انکار کرتا ہے۔ وہ اعتراف اور اعلان کرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ نہ مجھ میں اس کی استطاعت ہے، نہ کوئی اختیار۔ قرآن اس عقیدہ کو باطل اور کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کی خود آگہی اور خود اعتمادی فنا ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ کا قوم پر بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے خود اعتمادی کا پیغام عام کیا اور ان غیر قرآنی معتقدات کے خلاف جہاد کیا جس سے انسان کی خود اعتمادی میں ضعف آ جاتا ہے۔ وہ تقدیر پرست انسان کو جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ ؎

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

وہ اپنے فارسی کلام میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ:-

منکرِ حق تو کافر ہوتا ہی ہے لیکن میرے نزدیک منکرِ خویش کافر تر ہوتا ہے۔ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ تو اگر منکرِ حق ہو گیا ہے تو اس سے تیری بازآفرینی کا امکان باقی رہتا ہے لیکن اگر تو منکرِ خویش ہو گیا ہے تو اس سے تیرے زندہ ہونے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

تقدیر کے بعد دوسرا باطل عقیدہ تقلید کا ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی معاملہ کا فیصلہ خود نہ کرے بلکہ دوسروں کے فیصلوں کو اپنے لئے سند اور دلیلِ راہ قرار دے لے۔ قوتِ فیصلہ کی کمی، خود اعتمادی میں ضعف کی دلیل ہوتی ہے۔ اور اس قوت کا ختم ہو جانا، مرگِ بے شرف کی علامت ہے۔ قرآنِ کریم نے مذہبی پیشوائیت اور مسلکِ خانقاہیت کو اسی لئے باطل قرار دیا ہے کہ ان میں انسان کی خود اعتمادی باقی نہیں رہتی۔ وہ، دنیاوی امور میں فیصلے اربابِ مذہب سے کراتا ہے، اور اپنی ذات کے متعلق فیصلے، پیروں مرشدوں سے۔

اِن کے ارشاد فرمودہ وِرد وظیفے۔ اِن کے عطا کردہ تعویذ گنڈے، سب اِن کے معتقدین میں خود اعتمادی کمزور کرنے کے حربے، اور اِن کے شعبدے اور کرامات ان کی غور و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج اور اُن کی قوتِ فیصلہ کو سلب کرنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ یہی وہ مسلکِ خانقاہیت ہے جسے اقبالؒ زندہ قوموں کی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دینے کی سازش قرار دیتا اور اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ ؎

مخدوم کہ پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اِک زندہ کرامات

اِس ضمن میں مجھے یہودیوں کی ایک روایت یاد آ گئی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم سے کہا کہ میں سمندر پر لاٹھی ماروں گا تو وہ دو نیم ہو جائے گا۔ انھوں نے لاٹھی ماری تو کچھ بھی نہ ہوا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حیران تھے کہ یہ کیا ہوا، کہ اتنے میں اُن کی قوم کے ایک نوجوان نے دھڑام سے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور سمندر دو نیم ہو گیا۔ مقصد اس روایت سے یہ بتانا نظر آتا ہے کہ معجزات، مردانِ خود آگاہ کی جراتوں کے صدقے ظہور میں آتے ہیں —— انہی کے ہاتھوں خدا کا پروگرام تکمیل تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب مجاہدینِ بدر کے متعلق خدا نے کہا کہ تیر ہمارے

ترکش کے تھے لیکن نکل رہے تھے ان جانبازوں کی کمانوں سے، تو اس سے بھی مقصود تھا۔ اقبالؒ نے اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اور، باطل کا سب سے زیادہ خطرناک اور انسانیت کُش نظام ہے، ملوکیت ــ ملوکیت کے معنی ہیں انسان کا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے احکام کا مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ اس سے اس میں خودداری اور خوداعتمادی کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ عہدِ قدیم کا شاہنشاہیت کا نظام ہو، یا عصرِ حاضر کی ڈکٹیٹر شپ یا (بقولِ اقبالؒ) "جمہوری تماشا" سب ملوکیت کے مختلف پیکر ہیں۔ اس زمانے میں فرعون ان ابنائے قوم کو کچل کر رکھ دیتا تھا جن میں ذرا سی احساسِ خودداری کی نمود دیکھتا۔ اِس دور کے لیڈر، اپنے زورِ خطابت سے قوم کو ایسا ہپناٹائزڈ کر دیتے ہیں کہ اِن میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ سب ان کے اشاروں پہ، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ ہٹلر اسی لئے اپنے رفقاء سے کہا کرتا تھا کہ عوام سے شام کے وقت خطاب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اُس وقت دن بھر کی محنت سے ان کے اعصاب تھکے ماندے ہوتے ہیں اور وہ بہت جلد، ہپناٹائزڈ ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے یہ کہہ کر کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے، باطل کے اِس عالمگیر نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جس کی رو سے چند افراد، باقی نوعِ انسان کی خوداعتمادی کو سلب کر لیتے اور اس طرح انہیں شرفِ انسانیت سے محروم کر دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے اِن تمام انسانیت سوز نظریات کے مقابلہ میں قانونِ مکافاتِ عمل کا عقیدہ پیش کیا، جس کی رو سے ہر فرد کو اُس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس طرح اس نے ہر انسان میں خودشناسی، خودآگاہی اور خوداعتمادی کا احساس بیدار کیا۔ یہی قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل ہے۔ اور اسی پر یقینِ محکم وہ شمشیر ہے جس سے احساسِ کمتری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اِس سے انسان میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا کی عام مشکلات اور مصائب تو ایک طرف، موت تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتا ہے کہ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اقبالؒ نے کس قدر صحیح کہا ہے کہ ؎

جانے کہ دادند، دیگر نگیرند   آدم بمیرد از بے یقینی

خدا نے انسان کو جو زندگی عطا کی ہے وہ اُسے واپس نہیں لیتا۔ انسان خود اپنی بے یقینی کی وجہ سے مرتا ہے، اپنی ذات پر یقینِ محکم سے اسے حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ اور یہی تو معنی ہیں جل کہ خدا بھی اسی لئے زندہ و پائندہ ہے کہ اسے اپنی ذات پر یقینِ کامل ہے۔

والسلام

فرقہ اہلِ قرآن کی نمازیں

طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۵ء میں، پرویز صاحب کا ایک بصیرت افروز، معلومات افزا مقالہ شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا ـــــ فرقہ اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تجزیہ ـــــ اس کا ملخص یہ تھا۔

۱۔ قرآنِ مجید کے اپنے دعوے کے مطابق، اس کے منزل من اللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ کہ وہ نہایت واضح اور مبین کتاب ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں باہمی اختلافات ہیں لیکن ان کی سند روایات یا فقہ ہوتی ہے، قرآنِ مجید نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے اختلافات سے قرآنِ مجید کے مذکورہ بالا دعوے پر زد نہیں پڑتی۔

۳۔ ہمارے زمانے میں ایک نئے فرقے نے جنم لیا جس کے بانی (مولوی) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) تھے۔ انہوں نے کہا کہ دین کے تمام احکام کی جزئیات تک قرآنِ مجید کے اندر موجود ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے نماز کو لیا اور کہا کہ قرآن کریم کی رُو سے: پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ صبح کی نماز کی دو رکعت۔ ظہر، عصر، عشاء کی چار چار۔ اور مغرب کی تین۔ ہر رکعت میں دو سجدے۔ مروجہ نمازوں کے مطابق۔ البتہ نماز کے اذکار مختلف بتائے۔

ان کے برعکس، اس فرقہ کے دیگر مولوی صاحبان نے، ان سے مختلف جزئیات بتائیں۔ (مثلاً موجودہ فرقہ اہلِ قرآن (جس کا ترجمان ماہنامہ بلاغ القرآن ہے) کا کہنا ہے کہ قرآنِ مجید میں تین نمازوں کا حکم ہے۔ ہر نماز کی دو رکعت، اور ہر رکعت میں ایک سجدہ۔ نماز کے اذکار میں بھی اختلاف ہے۔

۴۔ پرویز صاحب نے کہا کہ سوچئے کہ ان دونوں کا دعویٰ ہے کہ قرآنِ مجید میں نماز کی جزئیات کی یہ تعداد ہے۔ اور ان دونوں میں بین فرق ہے۔ اس سے قرآنِ مجید کا یہ دعویٰ باطل قرار پاتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

۵۔ بلاغ القرآن والوں نے مولوی عبداللہ (مرحوم) کے متعلق تو کوئی جواب نہ دیا، البتہ یہ کہا کہ دیگر مولوی صاحبان ان سے (بلاغ القرآن والوں سے) متفق تھے۔ جس طرح ہر فرقہ میں ہوتا ہے، یہ کہہ کر وہ خوش ہو گئے کہ ہم نے اپنے آپ کو حق پر ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اتنا نہ سوچا کہ بات، یہ نہیں کہ آپ کے ساتھ کون کون متفق ہیں (یا متفق تھے) بنیادی بات یہ ہے کہ اگر وہ شخص بھی یہ دعویٰ لے کر اٹھیں کہ قرآن کا یہ حکم ہے۔ اور وہ حکم ایک دوسرے سے مختلف ہو، تو قرآن کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ مولوی عبداللہ (مرحوم) اور بلاغ القرآن والوں کا باہمی اختلاف بین ہے۔ اور اس سے قرآنِ مجید پر جو زد پڑتی ہے

وہ ظاہر ہے ــــــ لیکن فرقہ بندی میں تو مصیبت ہی یہ ہوتی ہے کہ انہیں نہ اس سے غرض ہوتی ہے کہ اس سے خدا پر کیا زد پڑتی ہے، نہ اس سے کچھ واسطہ کہ اس کی کتاب کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد تو اپنے فرقہ کو قائم رکھنا ہوتا ہے تاکہ ان کی اپنی نمبرداری قائم رہے۔

اب، قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے ہمیں ایک پمفلٹ بھیجا ہے جس کا نام ہے ــــ منکرینِ حدیث کی تفاصیل ادلبعہ (چار نمازیں) مؤلفہ ہیں۔ مولانا مولوی نورحسین صاحب گھرجاکی ــــ اسے مکتبہ نور، گھرجاکھ (گوجرانوالہ) نے اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے فرقہ اہلِ قرآن کے چار (غالباً) ہم عصر مولوی صاحبان کی کتابوں (یا رسالوں) سے جزئیاتِ نماز کی تفصیل پیش کی ہے۔ اُسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

(۱) مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم

(رسالہ صلوٰۃ القرآن کما علّم القرآن) وہ اس میں لکھتے ہیں:۔

میں تم کو سچ سچ کہتا ہوں اور اللہ تعالےٰ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس رسالہ میں صرف قرآن کی سکھائی ہوئی نماز کو لکھا جاتا ہے۔ یہی وہ نماز ہے جس کے پڑھنے کا خدا نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ اور یہی وہ نماز ہے جو تمام انبیاءؑ و رسلؑ اور خود محمد رسول اللہ پڑھتے پڑھاتے رہے۔

پانچ نمازیں۔ فجر کی نماز میں دو رکعت۔ ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار۔ مغرب میں تین رکعت فرض ہیں۔ ہر رکعت میں دو سجدے۔ (اذکار میں فرق ہے)۔

(۲) مولوی حشمت علی مرحوم

(رسالہ صلوٰۃ القرآن کما علّم الرحمٰن) میں لکھتے ہیں:۔

فقیر نہایت صداقت سے اللہ تعالےٰ کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو نماز اپنے بندوں پر فرض کی تھی اور ان سے پڑھوانی چاہتا تھا اس کو قرآن میں مفصل ن فرما ... نبوت اور خلافت میں ہی ایک قرآنی نماز تھی۔ یہی نماز تمام انبیاء اور محمد رسول اللہ پڑھتے رہے۔

پنجگانہ اوقات نماز قرآن مجید میں مفصل مذکور ہیں۔ تین یا چار نمازیں پڑھنے والا مسیلمہ کذاب۔ مفتری علی اللہ۔ منکر قرآن اور جہنمی ہے۔

ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار۔ مغرب کی تین اور فجر کی دو رکعتیں قرآن سے ثابت ہیں۔ صرف دو رکعت بتانے والا۔ یا صرف ایک سجدہ کرنے والا دوزخی ہے۔ ہر رکعت میں دو سجدے ہیں۔ (اذکار میں فرق ہے۔)

(۳)۔ مولوی محمد رمضان (مرحوم۔ گوجرانوالہ)

رسالہ صلوٰۃ القرآن کما علّم اللہ الرحمٰن، میں لکھتے ہیں :۔

جس صلوٰۃ کی اللہ حکیم علیم نے تعلیم دی ہوئی ہے وہ ہر طرح مفصل ہی مفصل۔ ہر طرح قرآن مجید میں مذکور ہے۔ لہٰذا قرآنی تعلیم کے مطابق نماز کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اور یہی قرآنی نماز ادا کرنے سے مولا کریم کو راضی کر سکتا ہے اور ابدی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اور جملہ مومنین کا عمل نمونہ یہی ہے۔ اور یہی قرآن نے نماز کی تعلیم دی ہوئی ہے۔

تین وقت ہی نماز کے ثابت و بیّن فی القرآن ہیں۔ صلوٰۃ عصر و مغرب، غیر اللہ کی ہوائے نفس۔ منگھڑت و خانہ ساز ہیں۔ نماز صرف دو رکعت ہی ہے اور یہی حکم موجود فی القرآن ہے۔ دو رکعت سے زیادہ۔ کسی میں تین اور کسی میں چار رکعت پڑھنا انسانی یقین ہے۔ رکوع سے سیدھا سجدہ میں چلا جائے۔ ایک رکعت میں سجدہ صرف ایک ہے۔ (اذکار میں بھی فرق ہے۔)

(۴)۔ سید رفیع الدین (مرحوم۔ ملتان)

رسالہ الصلوٰۃ للرحمٰن جاء فی القرآن ۔ میں لکھتے ہیں :۔

یہ قرآنی نماز جو قرآن نے تعلیم فرمائی ہے۔ جو جملہ رسل، انبیاء اور صالحین کے معمول بہ تھی۔ اور اسی نماز کے ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دیا ہے۔ لہٰذا اس قرآنی نماز میں صرف قرآن کے مطابق نماز کی ہیئت اور ہر ایک رکن میں جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ مومنین قرآن اس پر عمل کریں۔

روزانہ نماز کے اوقات قرآن میں نہ پانچ ہیں نہ تین۔ بلکہ متوسط چار ہیں۔ ان میں کمی (یعنی تین) یا بیشی (یعنی پانچ) کرنے والا اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوٰت کا مصداق ہے۔

چاروں نمازوں میں دو دو رکعتیں ہیں۔ لیکن پہلی رکعت میں تین سجدے اور دوسری میں چار سجدے کرے۔ یہی طریقہ کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ (اذکار میں بھی فرق ہے۔)

ہم نے ان اختلافات کو اوقاتِ نماز۔ تعداد رکعت اور سجدوں کی تعداد تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ ان میں نماز کی دیگر جزئیات اور اذکار میں بھی باہمی اختلافات ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ :۔

(ا) مولوی عبداللہ اور مولوی حشمت علی، قرآن مجید سے، پانچ وقت کی نماز۔ ہر نماز میں مروّجہ رکعتیں اور ہر رکعت میں دو سجدے ثابت کرتے ہیں۔

(ب) مولوی محمد رمضان، اسی قرآن سے، تین وقت کی نماز، ہر نماز کی دو رکعت۔ اور ہر رکعت میں ایک

سجدہ ثابت کرتے ہیں۔ اور

(ج) مولوی رفیع الدین، اسی قرآن سے، چار نمازیں۔ ہر نماز میں دو رکعت۔ پہلی رکعت میں تین سجدے اور دوسری میں چار سجدے ثابت کرتے ہیں۔

(د) بلاغ القرآن والے، مولوی محمد رمضان کے پیرو ہیں۔

آپ سوچئے کہ اس کے بعد اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ ہے آپ کے خدا کی کتاب جس میں نماز جیسے فریضہ کے متعلق اس قدر متضاد احکام ملتے ہیں، تو اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟ موجودہ اہلِ قرآن (بلاغ القرآن والے) یہ کہیں گے (اور اس کے سوا وہ اور کہہ کیا سکتے ہیں) کہ جو کچھ مولوی محمد رمضان (مرحوم) اور خود انہوں نے سمجھا ہے، وہ صحیح ہے۔ دوسروں نے قرآنی احکام کو سمجھا نہیں۔ تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ آپ کے خدا کی کتاب ایسی ہے جسے اتنا بھی صاف صاف کہنا نہیں آتا کہ نماز کے اوقات کتنے ہیں! اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہوگا؟ یاد رکھئے! فرقہ پرستی کی کد میں، اپنی امامت کو برقرار رکھنے کے لئے ضد پر اڑے رہنے کی بات اور ہے، ورنہ ان اعتراضات کا کوئی معقول جواب بن ہی نہیں پڑ سکتا ہے۔ ان اختلافات کی موجودگی میں، اس کے سوا کوئی اور نتیجہ مرتب ہو ہی نہیں سکتا کہ یا تو اس کتاب میں اس قدر اختلافات ہیں، اور یا یہ کتاب اس قدر مبہم اور غیر واضح ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ باطل قرار پا جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو پرویز صاحب نے کہا تھا کہ اس ہزار، بارہ سو سال میں کسی فرقہ نے قرآن کو ایسا نقصان نہیں پہنچایا، جیسا فرقہ اہلِ قرآن نے پہنچایا ہے ــــ صحیح مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر حکم کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اس نے بہت سے احکام اصولی طور پر دیئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین کرنے کا فریضہ، اسلامی مملکت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے سپرد کیا گیا ہے۔ نماز کی جزئیات اسی طرح متعین ہوئی تھیں۔ فرقہ بندی نے ان میں اختلافات پیدا کر دیئے اور چونکہ خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس لئے کوئی ایسی اتھارٹی باقی نہ رہی جو ان اختلافات کو ختم کر دیتی۔ اس وقت بھی وہ خلافت موجود نہیں۔ اس لئے، ہمارے لئے راہِ صواب یہی ہے کہ اُمت، جس جس طریق سے ان جزئیات پر کاربند ہے، انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ ان میں اگر کوئی بات صریحاً قرآن کے خلاف ہے تو اس کی نشاندہی کر دی جائے اور اس سے مجتنب رہا جائے۔ لیکن الگ فرقہ بنانے سے سخت اجتناب کیا جائے۔ یاد رکھئے! اگر (بفرضِ محال) قرآن کریم میں تین نمازیں لکھی ہیں اور آپ پانچ پڑھ لیتے ہیں تو اس سے کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ آپ دو نمازیں نفل کے طور پر پڑھ لیں۔ لیکن اگر آپ الگ فرقہ بنا لیتے ہیں، تو از روئے قرآن آپ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس سے آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کونسا جرم زیادہ سنگین ہے! اور پھر فرقہ بھی اہلِ قرآن جیسا، جس میں (جیسا کہ پرویز صاحب نے لکھا تھا) یہ لوگ' روزانہ نماز تو ایک طرف، جمعہ کی نماز، عیدین کی نمازیں، حتیٰ کہ خانۂ کعبہ میں نمازیں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہیں پڑھ سکتے۔ ہم اس فرقہ کے سربراہوں سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ ان کے پیشِ نظر اپنا تشخص قائم رکھنا ہوتا ہے، اور بس۔ ہم ان کے متبعین سے

یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اس طرح اُمت سے کٹ کر کیا کیا؟ سامری کو بُت گری اور بت پرستی کی سزا کے طور پر اچھوت قرار دیا گیا تھا۔ آپ نے خود ہی اپنے آپ کو اچھوت بنا لیا اور باقی مسلمانوں سے کٹ گئے۔ کیا آپ کے سربراہوں کا یہ فریبِ نفس یا مغالطہ آفرینی کہ یہ فرقہ نہیں، مکتبِ فکر ہے۔ اس خدا کی گرفت سے بچا سکے گا جس نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ آپ تو چند نمازوں کا کہتے ہیں۔ خدا نے اُس مسجد (ضرار) کو جہنم کا گڑھا قرار دے دیا تھا، جس کا نتیجہ مسلمانوں میں تفرق پیدا کرنا تھا۔ اُس مسجد کو گرا دیا (بلکہ جلا دیا) گیا تھا۔ یہ ہے تفرقہ پیدا کرنے والی نمازوں کا مقام بارگاہِ خداوندی میں! مسلمانوں میں جو فرقے پہلے سے موجود ہیں، اگر ہم انہیں مٹا نہیں سکتے تو ان میں اضافہ کرنے کے جرم کے مرتکب تو نہ ہوں۔ علاوہ ازیں، آپ کی اس روش سے خدا کی کتابِ عظیم کے خلاف جس قسم کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں، اس کا بھی تو خیال کیجئے۔ کیا آپ کی تین نمازوں کا "ثواب" آپ کو اس عذاب سے بچا لے گا جو قرآنِ مجید کو ان اعتراضات کا مورد بنانے سے آپ پر وارد ہوگا! یہ فرقہ چند دنوں کا مہمان ہے۔ (یہ محض رسالہ بلاغ القرآن کے ذریعے زندہ ہے۔) یہ اپنی موت آپ مر جائے گا لیکن آپ کے یہ جرائم تو مرنے کے بعد آپ کے ساتھ جائیں گے۔ کیا آپ نے سوچ رکھا ہے کہ عدالتِ خداوندی میں آپ ان کا آپ کیا جواب دیں گے؟ طلوعِ اسلام کو چھوڑیئے کہ اس کے متعلق یہ کہہ کر آپ کو فریب میں رکھا جاتا ہے کہ اُس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ خود آپ کے فرقہ کے اکابرین آپ کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ وہ کہتے یہ ہیں کہ "تین نمازیں پڑھنے والا مسیلمہ کذاب، مفتری علی اللہ، منکرِ قرآن اور جہنمی ہے۔ اور صرف دو رکعت بتانے والا، یا صرف ایک سجدہ کرنے والا دوزخی ہے۔" اور اس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس قرآن کی سند اور اتھارٹی ہے۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

۱۔ پاکستانی خریداران: ———— ۱۸/- روپے

۲۔ (غیر ممالک) بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ:۔ ۲ پونڈ ———— ۴۴/- 〃

۳۔ (غیر ممالک) بذریعہ ہوائی ڈاک برائے (۱) برطانیہ۔ سوئٹزرلینڈ۔ فرانس وغیرہ: ۴۴/- + ۴۴/۴۰ = ۸۸/۴۰ 〃

(۲) دبئی۔ بحرین۔ مسقط۔ شارجہ۔ کویت۔ سعودی عرب۔ ابوظہبی۔ قطر۔ سری لنکا اور افغانستان۔ ۴۴/- + ۲۰/۴۰ = ۶۴/۴۰ 〃

(۳) لیبیا۔ کینیا۔ یوگنڈا۔ جنوبی افریقہ۔ ۴۴/- + ۳۹/۶۰ = ۸۳/۶۰ 〃

(۴) امریکہ۔ کینیڈا وغیرہ:۔ ۴۴/- + ۹۲/۴۰ = ۱۳۶/۴۰ 〃

ارشادِ خداوندی ہے :

تمہارے لئے رسول اللہؐ کی زندگی بہترین نمونہ (ماڈل) ہے

- خدا نے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں خط و خال کو قرآن مجید میں محفوظ کر دیا تاکہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک، ماڈل کا کام دے۔
- لہٰذا، حضورؐ کی وہی سیرت قابلِ اعتماد اور یقینی ہو گی جو قرآن مجید کی تفصیل کے مطابق ہو۔
- پرویز صاحب نے عمر بھر کے تدبر قرآن کے بعد، ایسی سیرت مرتب کر دی۔ یہ ان کے عشق اور خرد کا قابلِ رشک آمیزہ ہے۔
- انداز اس کا یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت زیبِ عنوان ہے اور اس کے تابع ان واقعات اور احادیث کو ترتیب دیا گیا ہے جو قرآنی اصول کے مطابق ہیں۔
- نتیجہ اس کا یہ کہ اس سے قرآن مجید کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نورانی سیرت طیبہ وجہِ فروغِ دیدہ ہو جاتی ہے۔
- اس سیرت سے، معاندینِ اسلام کے ان اعتراضات کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ جو وہ وضعی روایات پر مبنی کتبِ سیرت کی رو سے کیا کرتے ہیں۔
- اس سیرتِ مقدسہ کو ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں کہ تاریخِ عالم سے اس پیکرِ حسن و رعنائی کی مثال لا کر دکھاؤ!
- یہ سیرتِ طیبہ

معراجِ انسانیت

کے نام سے تیسرے (تازہ) ایڈیشن میں شائع ہوئی ہے۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ کتابت، طباعت نہایت روشن۔ گردو پوش پرکشش۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت ۴۰۵ صفحات۔ قیمت مجلد ۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ ◁ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲، لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

مقامِ حدیث

کا تازہ ایڈیشن بہت سی ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ، شائع ہو گیا ہے۔

یہ وہ کتاب ہے:

جس میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ دین کے نظام میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

جس میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مخالفین اسلام نے کس طرح ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایسی وضعی روایات داخل کر دیں جن سے اسلام مسخ، اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابۂ کبارؓ کا کردار داغدار ہو کر سامنے آئے۔

جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا ہے جس کی رو سے کوشش کی گئی کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔

جس میں مثال کے طور پر "ان" احادیث" کو پیش کیا گیا ہے جن کی نسبت حضورؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن جن کے متعلق آپ ایک نگاہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعے کس طرح مرتب کئے گئے اور ان کے مرتب کرنے والے کون تھے۔

اس کتاب کا مطالعہ، آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ کرے گا اور آپ کو بے شمار کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دے گا۔

اور اس کتاب سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث مشہور کرنا، کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

کتاب عمدہ بکس بورڈ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

۲۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

اعلان انتظامیہ

ادارہ طلوع اسلام سے خط و کتابت، منی آرڈر، رجسٹری
پارسل، چیک، بنک ڈرافٹ، وغیرہ میں صرف

ناظم ادارہ طلوع اسلام

لکھا جائے، کسی کا نام نہ لکھا جائے کیونکہ اس سے بعض
اوقات کچھ دقتیں پیش آجاتی ہیں۔ اسے اچھی طرح
نوٹ فرمالیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

رشتہ مطلوب ہے

بی۔ اے پاس امور خانہ داری کی ماہر
اور نگرانی سلائی کڑھائی کی واقف۔ ایک تعلیمی
ادارہ میں امور طالبات کی منتظم ۲۳ سالہ دوشیزہ کے
لئے موزوں، با روزگار رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت بصیغہ راز ق۔ د۔ ف معرفت

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared,
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO
INDUSTRIES LIMITED